

وجود میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے باکس کو کھولا۔

اور یہ رات کے آخری پہر کا قصہ ہے۔

چھپا ہوا، چھپایا ہوا۔ سر نہ ہنسا۔ اس پر بات ابھی ممکن نہیں۔

آخری پہر کی پہلی بات ابھی نہیں۔



”اور خوش فہمی بڑے کام کی چیز ہے، یہ زندہ رہنے کے لیے کچھ اسباب بڑے اہتمام سے پیدا کر ہی دیتی ہے۔“ ان خوش فہمیوں کو امرجہ نے گلے سے لگالیا، مٹھی میں دبایا۔

دوسرا سمسٹر شروع تھا، اور جیسا کہ یونیورسٹی میں کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے پہلے سال یا پہلے سمسٹر میں چالیس فیصد رزلٹ حاصل کر لیا تو حقیقتاً ”آپ نے تیر مار لیا۔ اور امرجہ نے یہ تیر مار لیا تھا اس نے ساٹھ فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔

اور یونی میں ہی مشہور ایک اور مقولے کے مطابق آپ کو پہلے سمسٹر میں یونی میں موجود سب اسٹوڈنٹس لائق فائز، ذہین، فطین، مہیون، آئن، اشائن، عیونی یا پھر اسٹیفن ہاکنگ، رائٹ برادران یا الیکٹرونڈر گراہم بل کے جان بیشن یا لے پالک لگتے ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ گول فریم کی بڑی عینک لگائے اسٹیفن نظر آنے والا اور مکمل توجہ سے لیکچر کے دوران گردن ہلانے والا اسٹوڈنٹ دراصل ایک درمیانے درجے کا اسٹوڈنٹ ہے جس کی حقیقت رزلٹ کے بعد کھلتی ہے۔

یہ مقولہ بھی ٹھیک تھا، امرجہ کو اپنے علاوہ وہاں سب ذہین فطین نظر آتے تھے۔ لیکن رزلٹ کے بعد اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ سب ذہین فطین اس سے تقریباً پیچھے ہی رہے تھے، یہ وہی لوگ تھے جنہیں فریڈرقلو پوری آپ و تاب سے چنھا تھا۔ رات کو یہ خود سے ”ایک گھنٹے“ صرف ایک گھنٹے کا وعدہ کر کے نکلتے اور ساری رات گھوم پھر کر ٹیاج کا گڑگڑا گاتے ہوئے صبح کی کرنوں کے ساتھ واپس آتے۔

”وہ پھر سے تمہارا دوست بن جائے گا امرجہ!“

”دوست۔ اب میں مانچسٹر میں ہوں یا نہیں ہوں“

اسے اس سے بھی فرق نہیں پڑے گا اور تم دوست ہونے کی بات کر رہی ہو۔ وہ میرا دوست بھی نہیں رہا ایسی باتیں سن کر کون کسی کو دوست رکھے گا۔“

”وہ غصے میں ہے امرجہ۔ انھیں میں انسان بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔“

”صرف غصہ نہیں تھا، کاش یہ میرا وہم ہی ہو۔ یہ صرف غصہ ہی ہو۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟“ ویرا نے ہاتھ کی پشت سے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

امرجہ ویرا کی شکل دیکھنے لگی۔ اور خاموش رہی۔

”تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ نہیں کر سکتیں، تمہیں اس کی دوستی کی قدر تھی اور یقیناً جانوا امرجہ! میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس کے بارے میں ایسے سوچتی ہوگی۔ میری غلطی بے شک ہے۔ لیکن بے قصور تم بھی نہیں۔“

امرجہ جانتی تھی ویرا ٹھیک کہہ رہی ہے۔

”ابھی وہ ناراض ہے۔ زیادہ دیر تک تم سے ناراض نہیں رہ سکے گا۔ تم دونوں پھر سے دوست بن جاؤ گے، پھر سے۔“ ویرا دھیمی آواز سے اسے سمجھا رہی تھی اور وہ ویرا کی باتیں ایسے سن رہی تھی۔ جیسے یہی آخری تریاق بچا ہو اس کے لیے۔ خوش فہمیاں اور تسلیاں۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی اور جب چاپ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ رات کا دوسرا پہر بھی بیت گیا۔ وہ ویسے ہی گم صم بیٹھی رہی۔ اس میں حرکت کرنے کی جستجو نہ رہی تھی، زندگی اس میں صرف سانس کی صورت باقی تھی، ایک چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے گھوم رہا تھا۔ الفاظ اس کے ذہن میں پھر کی صورت چکرارے تھے۔

رات کا آخری پہر شروع تھا۔ وہ اٹھی اور الماری تک آئی۔ اس نے بہت اندر تقریباً ”چھپا کر رکھے ایک باکس کو نکالا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے

اور ہر وقت مدد کرنے کے لیے تیار رہنے والی لڑکی تھی؛
اپنی معصومیت میں وہ۔ عالمگیری حیثیت اختیار
کر چکی تھی کہ ولیم جو موقع ملتے ہی میگزین میں سے
چاکلیٹس، کوکیز نکال لیا کرتا۔ منجلا کے نام ہر قسم اٹھا
کر خود پر کیے جانے والے شے سے جان
چھڑواتا۔ بعد ازاں وہ منجلا کو ٹیٹ دیتا ہوا نظر آتا
۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ جھوٹی قسم کے ہر جانے کے طور
پر۔۔۔ ضمیر کی آواز۔۔۔

امرحہ کی کارکردگی اچھے اسٹوڈنٹس کی طرح تلی
بخش رہی تھی اور ظاہر ہے وہ پروفیسر کی نظر میں آچکی
تھی۔

سر رابرٹ نے یاد سے کلاس میں وہ کارڈ پڑھے جو
پہلی کلاس کے دن انہیں لکھ کر دیے گئے تھے اور جس
میں اپنے موٹو کے نیچے انہوں نے خود کو سو فیصد کا چیلنج
دیا تھا۔ سر رابرٹ نے جو طنز کیے وہ سننے سے تعلق
رکھتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے ہیک کا کارڈ لہرایا۔

ہیک ہو یونی میں ہر ایک کو کمپیوٹر گیمز کے چیلنج دیتا
ہو پایا جاتا تھا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی۔۔۔ تم ہوگی جس
میں اس نے رات دن لگا کر کارڈ نہیں بنایا ہوگا۔

”تم ماسٹر زان انگلش لٹریچر کیوں کر رہے ہو۔ تھری
ڈی میں ہی کوئی ڈگری لے لو۔ بہت نام اور پیسہ کماتے
ہیں تھری ڈی۔۔۔ تم ڈیر انفر۔۔۔“

اس کی شکل پر بے چاری چھا گئی۔
”طنز نہ کرو اور مرا۔۔۔ مجھے تو خود نفرت ہے اس سب
سے۔۔۔ لیکن کیا کروں یہ لت جان ہی نہیں چھوڑ رہی
تمہارے پاس کوئی ترکیب ہے اس سے جان چھڑانے
کی۔۔۔“

”مرحہ۔۔۔ مرحہ سمجھ میں آیا۔ تمہاری دیکھا
دیکھی بہت سوں نے مجھے او مرا کہنا شروع کر دیا ہے۔
تم اپنا لپ ٹاپ تو ڈالو۔۔۔“ مرحہ نے ”او مرا“ کا غصہ
نکالا۔ ”نہ رہے گلیپ ٹاپ نہ کھیلو گے گیمز۔“

”کیا بیشہ ہی تمہارا داغ ایسے شاندار انداز سے کام
کرتا ہے۔ او مرا۔۔۔؟“

”چلتا تو نہیں تھا لیکن تم سب کے درمیان آکر
پہلا لیکچر کئی پتنگ کی طرح ان کے ہاتھ آنے کا نام
نہ لیتا اور اگر یہ پتنگ کو دھچکا نہ کر بلا چا کر ان کے ہاتھ
آتی جاتی تو کلاس میں بیٹھ کر ان کے لیے آنکھیں
کھول کر کانوں کو ہمہ تن گوش کر کے پاپنا منا گوش
کر کے لیکچر سننا ایسے ہو جاتا جیسے ہوا میں اونچائی پر تتی
رسی پر نو آموز کا چلنا۔ اوہ میں گرا۔۔۔ آ۔۔۔ آئیں گرا اور
لوہہ گر گیا۔ بے چارہ۔۔۔

زلزلہ پر امرحہ کی آنکھیں کھل سی گئیں۔ یعنی
اس کا تو خیال تھا کہ سارے گورے ایسے ہوتے ہیں۔
ایسے کیسے؟

یہی بیٹھے بیٹھے راکٹ بنالینے والے، دریائے ٹیمز
میں کود کر دریائے سین سے نکلنے والے سپر میکروٹ
کمپیوٹرز کے چٹکیوں میں پاس ورڈز توڑ ڈالنے والے،
روبوٹ سے کم ایجاد نہ کرنے والے اور شیر سے کم
ڈکار نہ کرنے والے۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

ویسے امرحہ نے سننا تھا کہ پہلے سمسٹر میں ایسا زلزلہ
آجائے ایسی کوئی پریشان کن بات نہیں۔ سب سے شان
دار زلزلہ کرنا ٹنگ (انڈیا) کی منجلا کا رہا تھا جو اتنی کمزور
تھی کہ کلاس کا ہر اسٹوڈنٹ اسے ٹیٹ دینے کے لیے
بے تاب رہا کرتا تھا۔ اور اسے ٹیٹ دے کر بھول
جانے کی نیکی سمجھا کرتا تھا۔ ایک بار کلاس میں سرکین
نکار نے ایسے ہی کہا کہ منجلا ضرور گولڈ میڈل لے
گی تو کلاس کے اسٹوڈنٹ ڈلوڈنے بھر پور سنجیدگی سے
سر ہلا کر کہا۔ ”ضرور۔۔۔ اگر یہ مائچسٹر کی سر دیاں نکال
سکی تو۔۔۔“

”سر دیاں نکال سکی سے تمہارا کیا مطلب
ہے؟“ ساری کلاس کی دلی دلی تھی کبھی سے یہ واضح تھا
کہ وہ بات سمجھ چکے ہیں لیکن یہ پروفیسر بھی نانا۔
”پہلے سمسٹر کی پہلی برف باری میں ہی منجلا کا
دیہانت ہو جائے گا نا۔۔۔“

منجلا سمیت کلاس ہنس ہنس کر ہانپ ہو گئی۔ منجلا
اے کارل شپ۔ جیت کر مائچسٹرونی پڑھنے آئی تھی۔ ایگز امز
کے دنوں میں امرحہ نے ایک دو بار اس کے ساتھ بھی
گروپ اسٹڈی میں شرکت کی تھی وہ انتہائی بے ضرر

چلنے لگا ہے۔ ہوہگا۔“

یہی ہوہگا چھوٹی سی مانولی کی طرح آنکھیں جھپکتے اپنی چیز پر خود کو کس طرح سے غائب کرنے کی کوشش میں تھا۔ اور ظاہر ہے وہ ناکام تھا۔

ہیک۔۔۔ چلیج سو فیصد۔۔۔ موٹو ”ایسے پڑھنا ہے کہ حیران کرو دیتا ہے۔“

”ویل ہیک آپ کامیاب رہے۔ ہم سب کو حیران کر دیا آپ نے۔۔۔ ہیک کی حیران کن سو فیصدی کارکردگی پر پلےز ٹیبل بجائے جائیں۔“

زور شور سے ٹیبل بجائے گئے۔ زور شور سے ٹیبل وقفے وقفے سے بجتے رہے۔ جن کے زلزلے اچھے رہے تھے ان کے کارڈز پر روشن ستارے بنادے گئے۔

”تمہیں عالیان پڑھاتا رہا ہے۔۔۔ شکل سے تو تم لوڑ مل کلاس سے بھی نیچے کی مخلوق لگی ہو۔۔۔ اردو میڈیم میں پڑھتی رہی ہو کیا رزلٹ لینا تمہارے بس کی بات تو نہیں تھی پھر؟“ شہزاد نے اپنی ری بونڈ بھنوں کو کسی مستول کی طرح تان کر پوچھا۔

”ٹھیک کہا میں اردو میڈیم میں ہی پڑھتی رہی ہوں۔ اچھا ہوتا تم بھی پڑھ لیتیں۔۔۔ تو تمہارا شمار بھی چالیس فیصد والوں میں نہ ہوتا اور تمہیں کس نے کہا کہ عالیان مجھے پڑھاتا رہا ہے؟“

پتا نہیں پاکستانی اردو میڈیم میں پڑھنے کو گلی کیوں سمجھتے ہیں۔ انگریز تو انگریزی پڑھنے میں جھک محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ انگریزوں کو اس وقت شرم آیا کرتی تھی جب انہیں خود پر جبر کر کے لاطینی پڑھنی پڑتی تھی۔ دوسری اقوام اپنی مرضی سے ساری دنیا کی زبانیں سیکھ لیں گی لیکن جن کوئی زبان ان کی زبان کی جگہ لینے کی کوشش کرے گی وہیں وہ اپنی واضح تاپسندی کی ثابت کر کے اپنی زبان کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ دنیا کی کوئی زبان ان کی زبان سے اچھی ہے نہ ہوگی۔

”علی کامنز میں وہ گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا۔“ ری بونڈ۔۔۔ بالوں کو شہزاد نے ہاتھ لگائے بغیر

گردن کے جھپکنے سے شانوں سے برے کیا۔

امرحہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یعنی پاکستانی خواتین دنیا کے کسی بھی کونے میں رہیں۔ خصلت عظیم ”ٹوہ“ پر دل و جان سے نثار رہتی ہیں۔ کسی تمنے کی طرح بجائے۔ فخر و غور سے سرشار بھرتی ہیں۔

”وہ بزنس کا اسٹوڈنٹ ہے میں انگلش لرنر چرکی۔“

”وہ اتالالاق ہے کہ پروفیسر سے اچھا انگلش لرنر چر پڑھا سکتا ہے۔“

”وہ اتالالاق ہے آخر سب کو کیسے پتا تھا۔“ امرحہ دنگ سی رہ گئی۔

”تم اس سے ٹیوشن لیتی رہی ہو؟“ امرحہ پوچھتے بنا رہ نہ سکی۔

”تم اس کی جان چھوڑتیں تو وہ کسی اور کو ٹیوشن دیتا تا۔“ ہونٹوں کے کونوں کو استہزائیہ اچکا کر وہ لڑوی گولی کی طرح بد مزاجی دکھائی دینے لگی۔

امرحہ شہزاد کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ ”سر رابرٹ سے اچھا کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ میں نہیں مانتی۔“ امرحہ کو یہی جواب سوچا۔

”نہ مانو۔ وہ یونی کارج فیزر رہے۔ ساری ٹرافیاں اکٹھی کر لائے گا وہ۔۔۔ ویسے تم آج کل اس کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔ وہ بھی ڈپارٹمنٹ نہیں آتا۔“ شہزاد نے مکمل ایمان داری سے ”ٹوہ“ کی ڈیوٹی سرانجام دی تھی اور وہ اس میں غفلت کا شکار قطعاً نہیں ہوئی تھی۔

امرحہ کوئی بھی جواب دینے بغیر چلی گئی۔ شہزاد اس کی کلاس فیلو تھی جو Gravity Falls کی Pacifica کے نام سے زیادہ جانی جاتی تھی اسے عجیب و غریب ملبوسات پہننے پر لیڈی گاگامی کہا جاتا اور شوشوں بھی یعنی جب وہ قریب سے گزرتی تو شرارتی اسٹوڈنٹس مکھی اڑانے کے انداز سے ہاتھ لہرا کر ”شوشوں“ کر دیتے۔

شہزاد پاکستان کے ایک بڑے وزیر کی بیٹی تھی جن کے وزیر اعظم بننے کے امکانات کافی روشن تھے۔ وہ اسٹوڈنٹس اور پروفیسر سے ایسے مخاطب ہوتی جیسے

سرچین کئی لحظے اس کی شکل دیکھتے رہے۔ یہ بد تمیزی کی انتہا بھی بلاشبہ۔
”آپ کے ملک میں نہیں لیکن یہاں گرومنگ کورسز ہوتے ہیں۔ کلاس کے اسٹوڈنٹس آپ کو فنڈز جمع کروں گے آپ گرومنگ کلاسز لیں۔ جب بات کرنا سیکھ جائیں تو آجائیے گا۔ ہم آپ کو ڈگری دے دیں گے۔“

”تو آپ گرومنگ کلاسز لے کر آئے ہیں؟“
”اگر آپ کے ساتھ میرے دو تین مزید مکالمے ہوئے تو یقیناً مجھے بھی لینی پڑیں گی۔“
امرجہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ سارا وقت کلاس میں سر جھکا کر بیٹھی رہی بعد ازاں وہ سرچین کے آفس گئی اور ان سے معذرت کی۔

”آپ کیوں معذرت کر رہی ہیں؟“ وہ مسکرانے لگے۔

”سر! ہمارے ملک میں سب شہزادے نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ استاد کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔ اگر پروفیسر میرے آگے چل رہے ہوں تو میں نے بھی قدم بڑھا کر ان سے آگے نکل جانا نہیں چاہا۔ میرے دادا کہتے ہیں تمہاری زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کبھی استاد سے آگے ہو کر نہ نکلو، استاد محترم کو اپنی پشت نہ دکھاؤ۔ یہ انتہا درجے کی بے ادبی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔
”میں ان خوش قسمت پروفیسرز میں سے ہوں جنہیں ہر سیشن میں ایسے اسٹوڈنٹس ضرور ملتے ہیں جن کے لیے ہم ہمارا احترام فرض کی طرح ہوتے ہیں۔“

جھنگ پاکستان کا طالب دو سال پہلے میرا اسٹوڈنٹ تھا جہاں کہیں مجھے دیکھ لیتا اپنی رفتار آہستہ کر لیتا، وہ گناہ سمجھتا تھا میرے آگے چلنا، میرے سر پر اپنی چھتری تان کر خود گیلہا جاتا تھا۔ میری چھتری کو پکڑ کر مجھے کار تک چھوڑ کر آتا، ایک بار نشو سے اس نے میرے گیلے جوتے صاف کیے اور یہ کام اس نے بغیر کسی شرم کے کئی سو اسٹوڈنٹس کی موجودگی میں کیا۔

کریشن کے پیروں سے لیے اپنے پیما کے محل نما گھر کے گھر پلو ملازم سے مخاطب ہو۔ جو لباس وہ ایک بار پہن لیتی دوبارہ کوئی اسے اس لباس میں نہ دیکھ سکتا۔ اس کے جوتے پیچھو، قلم، ٹوٹ، بکس، لباسات اور ایسی ہی دوسری چیزیں اتنی مہنگی ہوتیں کہ انہیں دیکھ کر حقیقتاً ”اسٹوڈنٹس کو ہول اٹھتے کم۔“

”ف کیا اس نے انہیں خریدنے کی جرات کی۔ کیا واقعی۔۔۔ اس نے انہیں خرید لیا۔ اور یہ کیا یہ تو اس کے ہاتھ میں بھی ہیں۔“

”اسی لیے پاکستان میں غربت کا یہ عالم ہے۔ سارے بجٹ سے تو لیزڈی گاگا کے کپڑے جوتے ہی آجاتے ہیں۔“

جرمن جو سکیل نے بڑی جرات سے اس کے منہ پر کہہ دیا تھا اور اس لیزڈی گاگا نے پاک افواج کے ذخیرے میں موجود سارے بارود کو آنکھوں میں بھر کر اسے گھورا۔ اور بس۔۔۔ ایسے ویسوں کے منہ لگنا اس کی شان کے سراسر خلاف تھا۔

ایک دن لیکچر کے دوران وہ اپنے آئی فون کے ساتھ مصروف تھی۔ اسے کئی بار اس حرکت پر سرزنش کی جا چکی تھی۔ پر کیا کیا جاسکتا تھا وہ اتنا بارود اپنے ساتھ رکھتی تھی کہ کوئی کچھ کہہ بھی دیتا تو بھی فائدہ نہ ہوا کرتا۔

مزید اس نے یہ کیا کہ مزے سے پچھلی رو میں بیٹھے جوتا پن کی تصویر کلک کی۔ فینڈ کی وجہ سے جوتا پن کے لیے مشکل تر ہو رہا تھا سر کو ڈھکنے سے روکنا اور آنکھیں پوری کھول کر متوجہ رہنا۔ لیزڈی گاگا نے باقاعدہ کرسی سے کھڑے ہو کر پیچھے جوتا پن کی طرف رخ کر کے یہ حرکت کی۔

کلاس دنگ رہ گئی۔
”اگر آپ کو لیکچر نہیں سننا تو آپ کلاس سے آؤٹ ہو جائیں۔ اور باہر نکل کر مائچسز کی تصویریں اتاریں۔“ سرچین نے کسی قدر خلل سے کہا۔

”سننا ہے اگر کسی کام کا ہوا تو۔۔۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکا کر کہا۔

طاقت عود کر آجاتی اور وہ تن دی سے پھر سے پڑھنے لگتی۔

اگر سب کچھ پہلے جیسا ہوتا تو عالیاں شاید اس کے پاس آتا۔ نیلے پیلے سفید پھول کے کر اور کتا۔

”اگلی بار اس سے بھی اچھے رزلٹ پر تمہیں اس سے بڑا پھولوں کا کمال ملے گا، تیرے سمسٹر میں پھولوں کا گودام ملے گا۔ اور چوتھے اور فائنل میں۔۔۔ وہ شرارت سے مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

سارے مرجھائے پھولوں نے امرجہ کے گرد ڈھیر لگا لیا۔ وہ اٹھ کر لائبریری آگئی۔

”کیسی ہو مینڈکی؟“

وہ اپنی کتابیں ایٹو کروا چکی تھی اور یونیورسٹی کا منوس ترین انسان کارل اپنی کتابیں ایٹو کروا رہا تھا۔ چیونگم سے وہ ایسے پٹنے پھوڑ رہا تھا اور اتنی تیزی سے جیسے اسے جلد از جلد اس چیونگم سے ننھا منام تیار کرنا ہو اور وہ ہم اس کے منہ میں بی تیار ہونا ہو۔ اور پھر اس نے وہ کم پیڑے مارنا ہو۔

امرجہ سے بہترین کون مستحق ہو گا کارل کے ہم کا۔ کچھ شر کا غصہ۔ کچھ سے زیادہ اپنے اندر کا دکھ اور کچھ ہارٹ راک میں ڈسک کا چلایا جانا، اس نے ہاتھ میں پکڑی تین وزنی معمولی کتابوں کا سیٹ اس کے سر پر دے مارا۔

”مجھ سے دور رہا کرو۔ مینڈک ہو گے تم، تمہارا خاندان اور آگے پیچھے کے سب فلاں فلاں اور فلاں فلاں۔۔۔ تم سے آگے کا قہرہ اس نے اردو میں کہا اور آنکھوں میں اگ بھر کر اسے گھورنے لگی۔

کاؤنٹر پر کھڑے تین لائبریرین کے ہاتھ کام کرتے رک گئے۔ پچاس ساٹھ کے قریب اوپر اوپر کھڑے، آتے جاتے اسٹوڈنٹس نے باقاعدہ رک کر اس منظر کو دیکھا۔ ذرا دور کھڑی منجلا کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں۔ بھلا منجلا کو کیا ضرورت پڑی تھی اپنے وزن سے زیادہ کتابیں اٹھانے کی۔

اور کارل۔۔۔؟

کارل کا چیونگم جتنا جڑا رک گیا، ہم اس کے جڑے

اور مجھے یہ بھی بتا لینے دو کہ وہ نشوونہ اپنے ساتھ پاکستان لے گیا۔

میں ایک استاد ہوں امرجہ، استاد میں تعصب نہیں ہوتا۔ تمہاری غلطی تمہاری ہوگی تمہاری قوم کی نہیں، ہم تعصب کو ختم کرنے والے ہیں، تعصب پھیلانے یا پالنے والے نہیں۔ میں مانتا ہوں پاکستان میں کئی شہزادے ہیں، لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ پاکستان طالب غفور جیسے لوگوں سے بھی بھر پڑا ہو گا۔“

امرجہ لا جواب ہو گئی۔

ایک بار شہزاد کے پیلا یونیورسٹی آئے تو وہ انہیں ایسے یونیورسٹی دکھاتی رہی جیسے ہوتی ہو۔

”اگلے چند سالوں میں یہ بھی ہماری ہو جائے گی،“

”ہاں ہے نا یا؟“

اور سویت پیلا کہتے ہوں۔

”کوئی شک؟“

تو یہ شوں شوں شہزاد بھی عالیاں کے بارے میں خبریں رکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی اور یقیناً ”اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ لیکن وہ رسائی صرف امرجہ کی ہو سکتی تھی۔

علی کا منر کے بارے میں بیٹھے وہ خود کو اداس ہونے سے روک رہی تھی۔ اس کا رزلٹ اچھا رہا تھا اور ظاہر ہے وہ خوش ہو کر بھی خوش نہیں تھی۔ ایگزامز کے دنوں میں عالیاں نے اسے یونی کون (crown Uni) دیا تھا۔ جس کی پیشانی کے سینک پر سفید چٹ تھی اور عالیاں کی لکھائی میں۔

Keep calm and ride a uniconron into exams.

لکھا تھا۔ ایگزامز کے دنوں میں کم و بیش ہر اسٹوڈنٹ کے اسٹڈی ٹیبل پر یہ یونی کون نظر آتا ہے۔ کچھ سینئر فریشرز کو دیتے ہیں۔ کچھ گھروں سے لے کر نکلتے ہیں۔ لیکن اس بے جبر امرجہ کو عالیاں نے دے دیا تھا۔ ایگزامز کی تیاری کے دوران وہ تھک جاتی تو اس چٹ کو دیکھ لیتی اور جیسے اس میں ایک نامعلوم سی

لی تھی۔ اس کی لپکی ہی نہ تھی تو پھر سے کیسے اس کے پاس چلی جاتی۔ اسے ویرا کے پاس جانا پڑا۔

”تم اس سے کیوں الجھیں؟“

”دماغ چل گیا تھا میرا۔“

”کچھ کرتی ہوں۔ پرسکون رہو تم۔“ ویرا کارل کو فون کرنے لگی۔

”وہ کہہ رہا ہے وہ تمہیں کل دے دے گا۔“

”آج ہی کیوں نہیں؟“ اس کی شکل پر ہوا یاں اڑنے لگیں۔

”تم نے اس کے سر پر کتابیں دے ماریں۔ ایک دن کی خواری تو وہ تمہیں دے گا۔“ ویرا نے اسے ہلکا پھلکا کرنے کے لیے بات کو مزاح کارنگ دیا۔

”اگر یہ ایک دن کی خواری ہے تو میں ہو جاتی ہوں خواہ۔“

”اگر تم کہو تو میں ہال سے جا کر لادوں اس کے روم سے۔“ ویرا پچھلے واقعے سے اس قدر شرمندہ تھی کہ کوشش کرتی تھی کہ اس کا زیادہ خیال رکھ سکے۔ اس کی کوئی بھی پریشانی ختم نہ ہو سکتی۔

”نہیں کل تک انتظار کر لیتی ہوں۔“

لیکن۔۔۔ لیکن یہ ایک دن کی خواری ہرگز نہیں تھی۔ اسے ویرا سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ ہاں چھاپے مار کر اس کے روم سے کتابیں لے آؤ۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اگلے دن کارل کتابیں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”نہ لو امرجہ دی مینڈ کی۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن پہلے مجھے سوری بولو۔“ کتابیں اس نے سینے کے ساتھ دونوں بازوؤں کی پلیٹ میں تھام رکھی تھیں۔ حفاظت سے۔۔۔ محبت سے۔۔۔

”سوری۔“ امرجہ کی مری مری آواز نکلی۔

جس وقت تم نے مجھے کتابیں ماری تھیں اس وقت کم سے کم دو سولوگوں نے ہمیں دیکھا تھا۔ یعنی میرے پاس دو سولوگ گواہ تھے۔ چشم دید گواہ۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ اس سے کیا کیا ہو سکتا تھا۔ کم یونیورسٹی سے بے دخل ہو تیس پھر میں تم پر پورے دس لاکھ پاؤنڈ کا ہینک

کے اندر ہی پھنسا اور دھواں کانوں، آنکھوں، ناک سے نکلا اس نے گردن کو خم دیا اور آنکھوں کو ذرا سا پھیلا کر امرجہ کو دیکھا، اسے دیکھا، یعنی تم۔ تم مینڈ کی۔ دی ناسٹ ڈک۔ تمہاری اتنی جرأت۔۔۔ آہاں۔۔۔ ہم۔۔۔ اوہ۔۔۔ آہاں۔۔۔ تاؤب آئی سی۔

زیر لب مسکراتا دو انگلیاں اس کی طرف اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر ایران کے لیے امر کی مارکہ واچنگ یو (watching you) کی دھمکی ایران کو۔ امرجہ کو دیتا لائبریری سے باہر چلا گیا۔

لائبریری کا ماحول جو اس کے سر پر کتابیں بڑھنے سے وہیں فریز ہو گیا تھا۔ پھر سے رواں دواں ہو گیا وہ اپنی کتابیں، سنبھالتی باہر نکلی اور یہ کیا؟ کارل ایک دم سے کسی چھلاوے کی طرح اس کے سامنے آیا اور اس کے ہاتھ سے کتابیں چھین کر لے گیا۔ دو سیکنڈ بھی کم ہوں گے اس نے اس سے بھی کم وقت لیا یہ کام کرنے میں، نائیاں کارل کے لیے اور امرجہ کے لیے ایک عدد ٹشو پیپر۔

”لائبریری کی کتابیں لے گیا۔“ فریز سی حالت میں امرجہ خوف سے بڑبڑاتی۔

”اوہ۔۔۔! امرجہ کا سر گھوم گیا، یہ اس نے کیا کیا۔ اس نے کارل کے ساتھ جتنی پیٹنگ کیوں لیا وہ لائبریری کی ملکیت کتابیں لے گیا تھا۔ وہ انہیں ضائع کر دے گا۔ اور اسے جرمانہ بھرتا پڑے گا۔ اتنا جرمانہ اس نے تو اتنی مہنگی اور تاریخی کتابیں نکلائی تھیں۔

اللہ امرجہ سے پوچھے اس نے اتنی فاش غلطی کیوں کی۔ جب وہ کارل کے دماغ جیسا دماغ نہیں رکھتی تو کارل کے غصے جیسا غصہ بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی کارل کو ڈھونڈتے، بڑا بوجھ بوند، آئڈنا بوجھ، سی آئی اے کے آگے پیچھے کے سب ہی رشتے دار بھی آجاتے تو بھی کارل کو نہ ڈھونڈا جا سکتا۔

وہ بزنس اسکول کے کارڈ روم میں کھڑی تھی اور بے بسی سے عالیان کے پاس جانے کا سوچ رہی تھی، لیکن آخری بار جو اس کی آنکھوں سے چھلکتی سرد مری دیکھ

کافی سے زیادہ فرق پڑا اس باب سے سب نے حیرت سے امرجہ کو دیکھا ساجل ایک بار پھر سے فرزند سا ہو گیا۔ گردنیں امرجہ کی طرف مڑ گئیں۔ آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

کارل نے ادائے بے نیازی سے کہ وہ تو امرجہ کے کسی ملے کو حل کرنے کے لیے اس کے پاس کھڑا ہے آنکھوں کی پتلیوں کو گول گول گھما کر ”فرزند“ ہو چکے اس منظر کو دیکھا۔ جیسے شانت سا ہو گیا۔

”یہ کچھ بہتر رہا ہے۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی کہ رونے کے علاوہ بھی تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ یعنی کمال کر سکتی ہو۔ یہ لو اپنی کتابیں میں ہنٹ (Hint) دیتا تو نہیں ہوں، لیکن تمہیں دے رہا ہوں۔ پھر ملتے ہیں۔“

دو انگلیوں سے اچانک وی کا اشارہ دیتا وہ عالیان کی طرح ہی ہوا میں اچھل کر پیروں کی تالی بچھتا غائب ہو گیا۔ اور امرجہ کا جی چاہا کہ وہ واپس کتابیں اس کے سر پر دے مارے۔

مارتی رہے۔ سارقتی رہے کہ آخر کار اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ ساری کتابیں تیز بلڈ سے کافی ہوئی تھیں۔ صفحات درمیان سے دو حصوں میں کیے تھے۔ وہ کبھی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ یہ کارل نے کیا ہے۔ اسے اپنی محنت کی کمائی سے جمع کیے گئے پاؤنڈز میں سے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

کارل زمین پر موجود سب سے زیادہ منحوس انسان۔

دودن وہ کھانا نہیں کھا سکی، سو نہیں سکی، اس کے جی میں آیا کہ وہ کارل کو وہ ساری بددعا میں دے ڈالے، جو پنجاب کی خواتین روایتی خاندانی لڑائیوں میں دیتی ہیں۔ لیکن وہ اسے چند امرجہ ٹائپ بددعا میں ہی دے سکی۔ جیسے کہ مانچسٹر میں جب بادل چھائیں تو آسمانی بجلی تم پر ٹوٹ پڑے اور اے گرے کے تمہیں سیاہ بھوت بنا دے۔ تم زندہ رہو لیکن مردوں کی طرح نمونی کے سب اسٹوڈنٹس تمہیں دیکھتے ہی چیخیں مارنے لگیں۔ دل براشتہ ہو کر تم یونیورسٹی ہی چھوڑ جاؤ اور یا یہ کہ تم

عزت اور قاتلانہ حملے کا ہرجانے کا دعو کرتا۔ لیکن ایک تو میں رحم دل بہت ہوں۔ چھوٹا سا میاؤں میاؤں ساجل ہے میرا۔ اور پھر تم سے پرانی دوستی بھی ہے۔ اب تمہارے سواری کو کم سے کم چار سو لوگوں کو تو سننا چاہیے تاہم کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بلاشبہ میں انصاف پسندی سے کام لے رہا ہوں۔“

دونوں انگلیش ڈپارٹمنٹ کے باہر کھڑے تھے اور وہاں اور قریب وجوار میں اتنے اسٹوڈنٹس تو تھے کہ کارل کی حسرت پوری ہو جاتی۔ امرجہ نے پھر سے اس وقت کو کوسا جس وقت اس نے دکھ اور غصے سے بھڑک کر کتابیں مارنے کی خوفناک غلطی کر ڈالی تھی۔ لب بھینچ کر اس نے آس پاس دیکھا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”سوری“

کارل سینے سے کتابیں لگائے ذرا سا کر اور سر کو خم دے کر کھڑا رہا اس کی گہری نیلی آنکھوں میں قہقروں کے جوار بھانا پھٹنے لگے۔ بڑی اداس اس نے کسی ملکہ عالیہ کی طرح گردن کو گھما کر آس پاس دیکھا، پھر ہونٹوں کو اراداً ”بگاڑ لیا جیسے اس صورت حال نے اس کے قومی وقار اور باعزت شخصیت کو صدمہ پہنچایا ہو اور اس کی ساکھ متاثر ہوئی ہو۔“

”کوئی متوجہ ہی نہیں ہوا۔“ بگڑے ہونٹوں کے ساتھ اس نے انگلی سے اشارہ کر کے امرجہ کو گردن گھما کر دیکھنے کا اشارہ کیا۔

امرجہ نے قطعاً ”گردن نہیں گھماؤں۔ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ ماسٹرز کر کے کیا کرے گی۔ یعنی اگر وہ یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور واپس چلی جائے تو کیسا رہے گا۔ اس کارل سے کہیں زیادہ رحم دل اسے منحوس کہنے والے تھے۔

”مجھے چلے جانا چاہیے۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں پورے پندرہ لاکھ پاؤنڈ کا دعو کروں گا۔“ کارل جانے لگا۔

”سوری“ امرجہ نے پوری شدت سے چلا کر کہا۔ ہرجانے کا دعو تو وہ کیا کرتا اسے لائبریری کی کتابوں کی فکر تھی۔

جانا جانتا تھا۔ امرجہ تو ناکارہ تھی اور وہ اسے اتنی بڑی یونی میں ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اکثر وہ یونی میوزیم کے کسی کونے کھد رے میں چھپی سی کھڑی ہوتی اور وہ پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا جیسے چلتے چلتے اسے خواب آ جاتے ہوں کہ امرجہ اس وقت کہاں ہے۔ جیسے وہ ریڈار ہو اور اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو کہ امرجہ نامی جہاز مارچسٹر یونی کے آسمان پر کس طرف کو چوپڑا زبے؟ امرجہ کو یہ خواب نہیں آتے تھے کہ وہ کہاں ہے؟ سارے خواب عالیشان کو ہی کیوں آئے؟ سب ہی الامام عالیشان کو ہی کیوں ہوتے؟

اس مغرب میں رہنے والے کو مشرقی آداب کس نے سکھائے؟
ڈھونڈ نکالتا اور ظاہر بھی نہ کرتا۔ ان گروں کا یاد شاہ وہ کب بننا؟

دوبارہ وہ عالیشان سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ وہ اسے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان جو کچھ ہو چکا تھا اسے ٹھیک ہونے میں وقت بھی لگنے والا تھا اور مرہم بھی۔

مرہم وقت کے تھال پر تھا اور وقت قسمت کی مٹھی میں۔ امرجہ کے ہاتھ میں نواب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔



دی بگ بین (The big ben) لندن ڈبل ڈیک بس اور لندن ٹیکسی برطانیہ کے لینڈ مارک مانے جاتے ہیں اور ”سائی“ کو مارچسٹر یونی کے اسٹوڈنٹس کا لینڈ مارک مانا جاتا ہے۔ بنا کسی شک و شبہ کے it all Say (سب کہہ ڈالو) یعنی سائی۔

”پیلے رنگ کے بورڈ پر نارنجی روشنائی سے یہ الفاظ سائی کی نکھائی میں لکھے ہیں۔ یونی میں شاید ہی کوئی ایسا بد نصیب ہو گا جو اس بورڈ کے مالک کو نہیں جانتا ہو گا۔“

سائی سیاہ فام نسلا ”امریکی لیکن برطانوی شہری ہے۔ اس کا اصل نام ایڈی ہے۔ ہلکے ہنکھے بالے بال، پتلا سا جس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لمبا دکھتا ہے۔

رات کو سوؤ تو کارل ہو صبح اٹھو ”ڈی ترینا“ کے لومڑی بن چکے ہو۔

اس واقعہ کے بعد وہ زمین پر موجود سب سے زیادہ دکھی لوگوں میں سے ایک ہو گئی۔ اسے پوری شدت سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اکیلی ہو گئی ہے۔ عالیشان اسے نہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار وہ اسے دکھائی دیا بھی تو اپنے آپ کو سیاہی میں چھپا پنے۔

”اگر میں کہیں گم ہو جاؤں تو تم مجھے کیسے ڈھونڈو گی؟“ ایک بار وہ امرجہ سے پوچھنے لگا۔ وہ کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ وہ گم ہونے جا رہا تھا۔ اور اسے یہ انتظام بھی رکھنا تھا کہ اسے ڈھونڈ لیا جائے۔

”تمہارے ان لمبے کانوں سے۔۔۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن ساتھ ساتھ سیاہ پتلیاں بھی نکلتی تھیں۔

”میری شناخت کے لیے یہ اتنا اہم کروار ادا کر س گے مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ لمبے۔۔۔ اور لمبے ہو جائیں تاکہ مجھے جلدی سے ڈھونڈ لیا جائے۔“

اب تو وہ جلدی سے گم ہو گیا تھا۔ امرجہ اسے ان بڑے اور لمبے کانوں سے پہچان کر ڈھونڈ نہ نکالے وہ انہیں ہوڈی میں چھپا کر رکھتا تھا کیا۔ معمولی بات تھی لیکن کافی تکلیف دہ بات تھی۔

ہارٹ راک کے باہر آخری ملاقات کے بعد امرجہ نے اسے بہت سارے دنوں کے بعد آکسفورڈ روڈ پر تیزی سے سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔ امرجہ بس میں تھی۔ کاش بس کی جگہ وہاں کوئی لاہوری رکشا ہو تا تو وہ رکشے والے سے کہتی کہ بھائی ذرا اس سرمنی ہوڈی والے کا پیچھا کرنا۔

وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخراں وہ کہاں اتنا مصروف رہتا ہے کہ دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اسی روڈ پر اس کے ساتھ چمپل قدی کرنے والا اسی روڈ سے اس سے دور بھاگ رہا تھا۔

وہ جیکے سے بزنس اسکول کے کتنے ہی چکر لگاتی وہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ واقعی میں ذہین تھا۔ چھپ

آکھیں گول گول اور نمایاں اور ان پر پتلے فریم کا نظر کا چشمہ۔
اپنے بیگ کو دونوں کندھوں پر بھنسائے کر رہے پیچھے لٹکائے وہ ماچس روٹی کا زمینی فرشتہ ہے۔ یونی کا دادا، دادی، ٹانا، ٹانی جی، چچا، ماموں، خالہ، بھائی، بہن اور دوست۔ وہ سب تھکے۔ وہ سائی تھکے۔
”یونیورسٹی میں اس کے بیٹھنے کی ایک ہی مخصوص جگہ تھی۔ علی لرنگ کا من کے باغ کے درخت تھے، ویسے اسے کہیں بھی روک کر بٹھایا جاسکتا تھا، وہ اعتراض نہیں کیا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ تو فرشتہ تھا اس تک رسائی بہت آسان تھی۔ جب وہ فارغ ہوتا درخت تلے آکر بیٹھ جاتا اور بیگ میں سے بورڈ نکال کر رکھ لیتا۔ مطلب۔“

”میں فارغ ہوں۔ ہم تن گوش ہوں آؤ میں سب سنوں گا اور تم سب کہہ ڈالو۔ اپنے درو۔ اپنی تکلیفیں۔ وہ سب فضول کی باتیں، جو کوئی اور نہیں سنتا۔ تمہارے رونے کے قصے، تمہارے نہ بننے کی وجوہات، تمہاری خالی جیب کی بدقسمتیاں، تمہارے کمروں سے کھانے کی اشیاء کا غائب ہوجانا، شیپوز پر فیومز، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی گمشدگی کا، آئے دن وقوع پذیر ہونا۔ اسائنمنٹس کا مکمل نہ ہونا۔ پڑھائی ایک بوجھ لگنا، برائی کتابوں کا نہ پلٹنا یعنی کتابوں کے پیوں کا بار اور کیفے میں اڑ جانا، ایکچر سے زیادہ تمہارا دھیان پارٹی میں لگے رہنا، گھر کی یاد نہ تانا۔

ظاہر ہے ہم اپنی باتیں اپنے دوستوں سے شیئر کرتے ہیں۔ خوف سے کسی سے بھی نہیں کرتے۔ ویسے دوستوں کے ساتھ شیئر کر دینے سے ہی وہ لی بی نیوز سروس کی طرح سارے میں نشر ہو جاتی ہیں تو ایک انجانے انسان کے ساتھ شیئر کرنے کا رسک کوئی کیوں کر لے گا۔ بلکہ نتیجے کے طور پر ان کا کیا حال ہو گا۔ نہ ختم ہونے والی لڑائیاں۔ اور تاریخی عظیم اسٹوڈنٹس اسکیڈلز کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز۔ یعنی انجام۔ یہی سب نا، لیکن آہستہ آہستہ لڑکے لڑکیاں اس کے پاس آنے لگے۔ خاص کر

”میں فارغ ہوں۔ ہم تن گوش ہوں آؤ میں سب سنوں گا اور تم سب کہہ ڈالو۔ اپنے درو۔ اپنی تکلیفیں۔ وہ سب فضول کی باتیں، جو کوئی اور نہیں سنتا۔ تمہارے رونے کے قصے، تمہارے نہ بننے کی وجوہات، تمہاری خالی جیب کی بدقسمتیاں، تمہارے کمروں سے کھانے کی اشیاء کا غائب ہوجانا، شیپوز پر فیومز، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی گمشدگی کا، آئے دن وقوع پذیر ہونا۔ اسائنمنٹس کا مکمل نہ ہونا۔ پڑھائی ایک بوجھ لگنا، برائی کتابوں کا نہ پلٹنا یعنی کتابوں کے پیوں کا بار اور کیفے میں اڑ جانا، ایکچر سے زیادہ تمہارا دھیان پارٹی میں لگے رہنا، گھر کی یاد نہ تانا۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو سب سننے کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔ ایڈی ایسی کہ سائی یونی کا چار سالہ پرائی اسٹوڈنٹ ہے۔ اس کی تاریخ کے بارے میں مختلف باتیں گردش کرتی رہتی ہیں۔
کچھ کہتے ہیں کہ جب وہ نیا نیا یونی آیا تھا تو کچھ معاملات کو لے کر اتنا پریشان رہا کرتا تھا کہ فلاں فلاں درخت تلے بیٹھ کر رونے لگتا۔ اس نے ایک دو اسٹوڈنٹس کو اپنی بات سنانے کی کوشش کی، لیکن کچھ کے پاس وقت نہیں تھا اور کچھ کا کہنا تھا کہ وہ بے کار

چھ کرتے ہیں۔ خوف سے کسی سے بھی نہیں کرتے۔ ویسے دوستوں کے ساتھ شیئر کر دینے سے ہی وہ لی بی نیوز سروس کی طرح سارے میں نشر ہو جاتی ہیں تو ایک انجانے انسان کے ساتھ شیئر کرنے کا رسک کوئی کیوں کر لے گا۔ بلکہ نتیجے کے طور پر ان کا کیا حال ہو گا۔ نہ ختم ہونے والی لڑائیاں۔ اور تاریخی عظیم اسٹوڈنٹس اسکیڈلز کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز۔ یعنی انجام۔ یہی سب نا، لیکن آہستہ آہستہ لڑکے لڑکیاں اس کے پاس آنے لگے۔ خاص کر

وہی پرانی شرت پہن جاتا کیا۔ میں نے اس کے لیے گفٹ بھی نہیں لیا۔ گفٹ میں نے اسے دینا بھی نہیں تھا وہ کون سا دیتی ہے۔ گفٹ نہ بھی دیتا ہو پیسے تو چاہیے ہوتے ہیں ناسالی! جب میں امیر آدمی بن جاؤں گا تو پوری ایک لاکھ کتابیں لائبریری کو چندے میں دوں گا۔ چودہ لاکھ۔ میرا خیال ہے چار لاکھ ٹھیک ہے۔ یونی کی لائبریری بھی تو اتنی بڑی ہے۔“

اگلا آتا۔ ”میں کل رات نشتے میں تھا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گھونسا مارا، وہ بے چارہ کوئی غریب افریقی تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے کے بیڈ تک لٹا کر گیا اور دروازہ ٹھک سے بند کر گیا۔ اس نے میری جیبیں بھی نہیں ٹٹولیں۔ میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ جلد ہی مجھے مل جائے گا۔ میں اسے معاف کر دوں گا۔“

نہیں۔ یعنی میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ مجھے کل رات نیند نہیں آئی۔ دعا کرتا آج آجائے۔ میں زمین پر سو رہا ہوں۔ بیڈ پر افریقی ڈرائیور سوتا ہے۔ ہاں آج کل اس کا بھوت ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ وہ مجھے کچھ کہتا نہیں ہے، پھر بھی مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

کوئی اور آتا۔ ”لڑا میری گرل فرینڈ ہے لیکن۔ لیکن مجھے اب اس کی دوستی وی آن اچھی لگتے لگی ہے۔ میں کیا کروں سالی۔ لڑا بھی اچھی ہے اور وی بھی اچھی ہے۔ میں بھی اچھا ہوں۔ ہم سب اچھے ہیں، پھر میں کیاں کروں سالی؟“

تو اب یہی سالی اگر جا کر لڑا کو بتا دے کہ پارٹی دوست اور تم بھی بھولی بھالی لڑکی تمہارا بوائے فرینڈ جو ناخن تمہاری دوست وی کی وی کو ہائیڈے ان میں دوبار ڈنر کے لیے لے جا چکا ہے۔ ہاں ہاں ان ہی بیسیوں سے جو اس نے گلے میں سوزش کے علاج کا بہانہ کر کے تم سے لیے تھے۔

تو لڑا کو اتنی سی بات بتا دینے پر کیا چھوٹا سا کتریتا طوفان لائبریری میں اڑا رہا ہے۔ نہ مگر آتا۔

پھر سالی لائبریری اشاف کے پاس جاتا اور کہتا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی کتابیں چرانے والوں میں سے

وہ جن کی نئی نئی کسی دوست سے لڑائی ہوئی ہوئی یا پروفیسر سے دیے دیے لفظوں میں کلاس میں ان کی بے عزتی کر دی ہوئی۔ کچھ صرف اسے لطیفہ سنانے کے لیے آتے۔ وہ لطیفے جو بعد ازاں انہوں نے کلاس میں کریک کرنے ہوتے کہ کلاس ہنسنے لگی بھی یا نہیں۔ کچھ گروپ کی صورت آتے۔

”ناسالی! دیکھو، ہم میں سے کون سب سے زیادہ کیوٹ لگتا ہے۔“

سالی انگلی اٹھاتا اور ایک ایک کی طرف اشارہ کر دیتا یعنی تمہاں کیوٹ ہو زیادہ تر اس کے پاس لڑکیاں آتیں۔

اب یہ سالی کا اصول تھا کہ برطانیہ امریکا بلکہ پورے یورپ کی فوج بھی اس کے گرد گھیر ڈال کر گھٹی ہو جاتی تو بھی وہ کسی کا بتایا ایک لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ اسے ہم سے اڑا دیا تو پے سے اگر کوئی اسے کچھ بتا گیا ہے دل کا حال سنا گیا ہے تو بس اب وہ سالی کے سینے میں دفن ہو چکا ہے، سوکس بینکوں کے سب ہی پیسے نکال کر بھی اس کے آگے ڈھیر کر دیے جائیں تو بھی اس کا منہ نہیں کھلے گا۔

یونی کے بہت سے اسٹوڈنٹس اسے رازوں کا ایٹم کہتے۔ ایک صرف اس کی زبان کھل جاتی تو وہ برباد ہو جاتے۔

اب کوئی لائبریری کی کتابیں چرا بیٹھا ہے۔ جیسے لائبریری سے کسی نے کتابیں الٹو کروا میں اور باغ میں بیٹھا یا کینٹین میں کافی چائے پیتے وہ ڈراسی دیر کو اپنی کتابوں سے غافل ہو گیا تو یہ کتاب چور بھائی صاحب یا بہن جی، اس غافل اسٹوڈنٹ کو سبق سکھانے کے لیے فوراً کتابیں لے کر غائب اور اب اس کا ضمیر اسے سونے نہیں دے رہا یا اسے پولیس کے سائزن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو وہ سالی کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے۔

”میں نے کتابیں چرا لیں۔ مجھے بیسیوں کی ضرورت تھی سالی! پچھلے دو ہفتوں سے میں دی برنٹ ورک نہیں کیا، کوئی فلم نہیں دیکھی۔ کرسٹن کی پارٹی میں

کروالیتا۔ سائی ایسی محبت کا کیا فائدہ کہ آپ اس کے سامنے اس لیے کم یوں کہ وہ پھر سے آپ کے وانتوں کو لے کر بیٹھ جائے گا۔ وہ ہر ملاقات میں میرے وانتوں کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ کیوں کرتا ہے وہ ایسا۔ میں اسے چھوڑ رہی ہوں سائی۔ میں بہت روؤں گی۔ پر یہ روز روز کے رونے سے اچھا ہے۔“

سوں سوں کرنے۔ آنسو بہانے اور صاف کرنے کا وقفہ۔

جب میں کیمسٹری کا نوبل انعام لے رہی ہوں گی تو اپنے بدبو دار بھائی کے ساتھ بیٹھنے مجھے ٹی وی پر براہ راست دیکھتے اسے ضرور دکھ ہوگا۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں ہو سکے گا، میری زندگی میں مارک نیک برگ آچکا ہوگا۔ اور میں اپنا نوبل انعام اسی کے نام کروں گی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں یہی کروں گی۔“

یونی میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا تھا سنا تھا ST. Anselm جہاں وہ رہتا تھا اکثر رات گئے اسے اٹھایا جاتا اور کمرے میں کہیں رکھا اس کا it all Say بورڈ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے پاس رکھا جاتا اور پھر اس پر اپنی فرسٹر کلاشن نکالی جاتی وہ ہڈی گراؤن سے ٹیک لگا کر یا زمین پر اسٹوڈنٹ کے ساتھ ہی بیٹھ جاتا اور رورو کر ستایا جانے والا حال سنتا۔

”مجھے گھر جانا ہے سائی۔ میری ماں کیا کھانے بناتی ہے۔ یہاں کے کھانوں میں بالکل مزہ نہیں ہے میری مائی کے ہاتھوں میں تو بالکل ذائقہ نہیں ہے۔ ہفتے میں ایک بار ان کے گھر جاتا ہوں۔ سارے ہفتے کا بچا ہوا کھانا مجھے کھلا دیتی ہیں۔ پیلا کتے ہیں مجھے زہر ہی کیوں نہ کھلا دے۔ ہفتہ اتوار تو ان ہی کے گھر رہے گا۔ پیلا جی۔ نہیں مجھے صرف اپنی ماں کے پاس جانا ہے۔“

جانندھر کے رہائشی پر تپ سنگھ کو رونا بڑا اچھا آتا تھا بے چارہ سائی بھی رونے لگتا تھا۔

”یونی میں سب اتنے اچھے اچھے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ایک میں ہی کیوں غریب ہوں سائی۔

ایک یہ رین بھی ہے۔ اسے پکڑو اسے جرمانہ کرو۔ بلکہ یونی سے ہی باہر کرو۔ اور یہ بریڈ ڈھنسل یہ ہر رات نشے میں دھت ہو کر کسی نہ کسی کو مار آتا ہے۔ ایک رات وہ دیوار پر بنے کارٹون کو دیر تک مارتا رہا اگر ریٹورنٹ کی دیوار ٹوٹ جاتی تو ریٹورنٹ انتظامیہ یونی پر ہرجانے کا دعو کر دیتی۔ پیسوں کے لیے نہیں غصہ کرتے لیے تو برائے مہربانی اس محمد علی کلے کو سنبھالیں۔

یعنی ایک ساٹھی کی وجہ سے آدھی یونی جرمانہ بھرتی یا یونی خالی کرتی۔ لیکن وہ سائی تھا سنا تھا بتانا نہیں تھا۔ ہاں تو زیادہ تر اس کے پاس لڑکیاں آتیں۔ جو لڑکی سائی کے پاس بیٹھی نظر آجاتی۔ اس کے ہوائے فریڈ کو بہت تشویش ہوتی۔ یا اس کے دوستوں کو۔ اور اگر وہ ساتھ ساتھ نشو سے آنکھیں بھی رگڑ رہی ہوتی۔ تو بس پھر خیر نہ ہوتی اور سائی بڑی شفقت سے اس سمجھی مٹی چڑیا کے آنسو نشو سے صاف کر رہا ہوتا۔

”سائی۔ میں نے اتنا منگا ڈر لیں لیا۔ دو گھنٹے لگا کر میک اپ کیا تیار ہوئی ہالوں کو کرل بھی کیا۔ اور اس نے کہا۔ کاش ٹھوڑے سے ہی سہی پر تمہارے وانت صاف ہوتے جب تم چھوٹی تھیں تو تمہاری ماما تمہارے وانتوں پر لگتا کیرا کیوں نہیں دیکھ سکیں۔ اتنی غافل ماما ہیں تمہاری۔ سائی اسے صرف میرے وانت نظر آرہے تھے۔ گلابی میک اپ سے جی میری آنکھیں نہیں۔ اور میں تو ہنس بھی نہیں رہی تھی۔ بول بھی کم رہی تھی پھر بھی اس کی ماما میرے وانتوں کو ہی گھورتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں وانتوں کا کینسر تو نہیں۔ بیٹھے بٹھائے انہوں نے میرے وانتوں کو کینسر کروایا۔ پھر اس کا بھائی آیا۔ جس کے آتے ہی گھر بدبو سے بھر گیا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا اور جانتے ہوا اس نے مجھے کیا کہا۔“ میرا ایک دوست ہے ڈنٹسٹ۔ اس نے وانتوں کے پیچیدہ ترین کیس نپٹائے ہیں۔ وہ تمہارے لیے بھی ضرور کچھ کر دے گا۔ اگرچہ میں اسے ناکام ہوتے دیکھ رہا ہوں۔“ پھر وہ منہ ہول کر بننے لگا اور بدبو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ پہلے وہ اپنی بدبو کا علاج کیوں نہیں

پائے جاتے۔
سائی سے بات کرنے کے چند طریقے تھے۔
”آپ صرف بولیں وہ صرف سنے۔“ زیادہ تر یہی کرتے۔

”آپ بولیں ساتھ وہ بھی بولے۔ آپ کی اجازت ہو تو۔“

”آپ بولیں۔ پھر وہ سوالات کرے۔ آپ بول چکے ہوں تو وہ آپ کو اچھی یا جیسی کیسی رائے دے۔ آپ کی اجازت ہو تو۔“

امرہ سائی کے پاس دو چار بار آپ کی تھی ایک بار جب اسے جاب نہیں مل رہی تھی اور ایک بار جب عالیان نہیں مل رہا تھا۔ اب کارل والے واقعے کے بعد وہ پھر اس کے پاس رونے کے لیے آئی تھی لیکن ایک ہندوستانی لڑکا راماس کے پاس بیٹھا تھا وہ جانے لگی تو رامانے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

وہ ہاتھوں کو گود میں رکھے سر جھکائے ایسے بیٹھا تھا جیسے ماچسٹر بونی میں اس کی مہندی کی رسم ادا کی جا رہی ہو۔ آپ ہنس سکتے ہیں لیکن یہی بیج ہے۔

”وہ میری دوست ہے۔ بہت اچھی دوست۔ ہاں صرف دوست۔ وہ مجھ سے ایک سال سینئر ہے یہ اس کا آخری سمسٹر ہے۔ پھر وہ چلی جائے گی۔ فرانس۔ اس نے کہا کہ میں فرانس آسکتا ہوں اسے ملنے۔ ہاں میں چلا جاؤں گا اس سے ملنے۔ ایک سال بعد جاؤں گا۔ پھر شاید پانچ چھ سالوں بعد جاؤں۔ پھر شاید آٹھ دس سالوں بعد۔ پھر میں بوڑھا ہو جاؤں گا اور ظاہر ہے مر جاؤں گا۔ ظاہر ہے ہمیں مرنا بھی تو ہو گا نا۔ شاید وہ بھی کبھی آئے اتر پردیش مجھ سے ملنے۔ میں اسے اپنا گاؤں دکھاؤں گا۔ لیکن سائی! یہ سب سوچتے ہیں رونے جیسا کیوں ہو جاتا ہوں۔ اور سائی وہ ابھی گئی نہیں۔ اور میں ابھی سے اسے بری طرح سے یاد کرنے لگا ہوں۔ ابھی تو وہ میرے پاس ہی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔ یہ اس کا آخری سمسٹر ہے۔ پھر

میرے پاس صرف ایک اچھی سی جینز ہے میں کب تک اسے ہی پہنوں۔ میرا آئی فون پرانا ہو چکا ہے۔ چھ مہینے میں نے وہی پرانا ہیرا سا کل اپنا رکھا ہے تمہے لگنے لگا ہے کہ میں سترھویں صدی کا کوئی جوکر ہوں جسے دیکھ کر بچے بھی نہیں ہستے۔“

آرٹ اسکول کا نوٹی۔
میں پاستا بنا کر رکھ گیا۔ آیا تو پلیٹ غائب کرہ لاک تھا سائی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کرہ لاک تھا یہ پانچویں بار ہوا ہے میرا پاستا غائب ہوا ہے۔ سنا ہے Oak ہاؤس میں جن دن کا سایہ ہے؟ وہ پوچھا بتا رہی تھی کہ کمرے میں ایک لڑکا ٹھنڈے مر گیا اور وہ بھوکا بھی تھا۔ سائی میں کیسے پتا کروں کہ وہ کس کمرے میں بھوک سے مر گیا۔ یا ٹھنڈے۔ کیا میرے کمرے میں۔ کوئی مجھے کچھ بتاتا ہی نہیں ہے میں انتظامیہ کے پاس گیا تو اس نے بڑے ٹھنڈے لیکن جملے ہوئے انداز میں کہا وہ تو شاید ٹھنڈا اور بھوک سے نہ مرا ہو، لیکن تم یقیناً خوف سے مرنے والے ہو۔ چلو میں تمہارا کرہ نمبر نوٹ کر لیتا ہوں۔ ”وہ پینڈت کرہ نمبر 302۔ Oak ہاؤس۔ بے جا خوف اور خدشات کے باعث کمرے میں مر رہا پایا گیا۔ اس کے بھوت سے بچنے کے لیے اپنی ذمہ داری پر کرہ لیا جائے۔ سن 2014“

میں نے اپنی وارڈ روم دیکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے نئے جوتے جو مانے میری سالگرہ پر مجھے دیے تھے اور جنہیں میں نے ایک بار بھی استعمال نہیں کیا تھا، وہ تو کوئی دس بار پہن کر وہاں رکھ چکا ہے۔ وہ سائی میں کس قدر لاہوا ہوں۔ میں نے روز اپنے جوتے کیوں چیک نہ کیے۔ میں کرہ لاک کرنا کیسے بھول گیا آخر۔ لیکن سائی۔ آخر کبھی ہم کرہ لاک کرنا بھول ہی جاتے ہیں نا، ہم سب ہی۔“

تو ماچسٹر بونی میں دوبارہ لڑکے لڑکیوں کے گروپ کو دوست رکھتے تھے یا صرف ایک کو سائی کی ضرورت کبھی نہ کبھی سب کو پڑتی تھی۔ ایک سننے والا کان سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ پروفیسر تک اس کے پاس

تھے کہ صبح وہ یونیورسٹی آئی تھی اور اپنی کلاس کے لیے جاری تھی کہ اس کے قریب سے گزرتی ایک لڑکی نے اسے روک لیا۔

”ہے تمہارا جو تاہست خوبصورت ہے۔ کہاں سے لیا ہے؟“

وہی عظیم عادت تعریف پر پھول جاتا۔ تو وہ بھی جھٹ پھول سی گئی اور بھول ہی گئی۔

”اپنے اسٹور سے جہاں میں کام کرتی ہوں۔“

”بہت خوبصورت ہے۔ اگر تمہیں برانہ لگے تو میں پین کر دیکھ لوں۔ میں آؤں گی تمہارے اسٹور اسے لینے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ اس نے جھٹ جو تا اتار کر اس کے آگے کیا اور اس گلابی اسکرٹ اور گلابی گالوں والی لڑکی نے جوتے کو پہننے کے بجائے اسے جھٹ اٹھایا اور یہ جاوہ جا۔

”ہے۔ (Hey)“ امرہ حیرت زدہ اسے آواز میں ہی دیتی رہ گئی، لیکن وہ کی نہ پلٹی۔ لیکن رک رک کر جھٹ کوئی اور اس کے پاس آ رہا تھا۔

”کون۔۔۔ بھوجھے کون۔۔۔؟“

کارل اور کون۔۔۔

اس کے ہاتھ میں اس کا گلابی باربی جو تا تھا۔

”یہ آج کے دن کے لیے میرے پاس رہے گا۔ تمہاری یاد دلانے گا۔“ جو تا اس کے آگے لہرا کر وہ چلا گیا، ہاں وہ ہنسنے لگا تو لگتا تھا کہ اسے آؤں گا۔ بھلے سے وہ تفصیلات دے دیتا، ہونا ہی تھا۔

”اف!“ اس نے آس پاس دیکھا، بشکل ایک جوتے سے چلتی شیخ پر بیٹھی۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی کوئی۔ یہ کارل اس کی جان کو آگیا تھا۔ اب ایک جوتے کے ساتھ وہ اندر جا سکتی تھی نہ باہر۔ اس نے ورا کو فون کیا، لیکن اس کا فون بند تھا وہ کلاس میں جا چکی ہوگی۔ ابن اون کا بھی بند تھا، سردی کے دن تھے زمین پر پیر تھنے کے لیے جرات چاہیے تھی اور پھر یوں لنگڑا کر چلنا۔ ناچار وہ اٹھی دو سرا جو تا بھی اتار اور صرف جرابوں کے ساتھ چلتی بس اسٹاپ تک

میرا بھی آخری سمسٹر آجائے گا میں بھی چلا جاؤں گا۔ ماچسٹر میں مل کر۔۔۔ دنیا میں بکھر کر ہم کھو جائیں گے ناسانی۔“

امردہ گود میں ہاتھ رکھے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے سر جھکائے بیٹھے اتر پردیش کے راجا کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا کہ اس لڑکی کے چلے جانے کے بعد وہ سیدھے سیدھے مر جائے گا۔

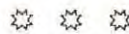
”اسے روک لورانا!“ سانی تو مشورے کی اجازت دی گئی۔

”روک لینا اتنا آسان نہیں۔۔۔ وہ فریج ہے۔ خاندان کے نام پر اس کے پاس ایک ماں اور ایک سوتیلی بہن ہے۔ اس کی ماں پہلے ڈانسر رہ چکی ہے۔ میرا خاندان۔۔۔ میں۔۔۔ میرا کچھ۔۔۔“

”کوئی ترکیب نکالو لیکن روک لو اسے۔۔۔ وہ گئی تو تم بھی اپنی اصل حالت میں نہیں رہ پاؤ گے۔ تم مر جاؤ گے رانا۔۔۔ اپنے زندہ رہنے کے لیے کچھ کر۔۔۔“

امردہ ایک تنگ راجا کو دیکھ رہی تھی جس فریج لڑکی کی بات وہ کر رہا تھا کافی مہینوں سے گاہے بگاہے شلوار قمیص، ساڑھی، چوٹی میں ملبوس نظر آتی رہی تھی ساتھ پر چھوٹی سی بندی بھی لگاتی۔ منے سے بالوں کو چوٹی کی صورت گوندھ کر رکھنے کی کوشش کرتی۔

جس قصے کو رانا بیٹھا رو رہا ہے، لمبے ہزاروں قصے ماچسٹر یونی کی دھرتی سے شروع ہو کر ختم بھی ہو جاتے تھے اور صرف خوش قسمت ہی ہوتے تھے جو آپس اور یادیں نہیں ایک دوسرے کا ساتھ لے کر نکلتے تھے مختلف ملکوں، سماجوں، روایتوں کے حامل اسٹوڈنٹس کا ایک جگہ اکٹھے ہو کر پڑھنا۔ دوست بننا۔۔۔ محبت میں مبتلا ہو جانا۔ اور روایات کے نام پر الگ ہو جانا اور پھر بے گھر ہونے میں آپس بھرتا۔ یہ سب کڑوی ہی سہی، لیکن حقیقت تھی۔ رانا کے بارے میں سوچتے اس نے اپنی نیند گنوا لی۔ وہ اپنی بات بتائے بغیر ہی پلٹ آئی تھی۔



کتاؤں والے واقعے کو بمشکل چند دن ہی گزرے

آئی۔

اور کیا۔

اس نے جوتا آگے کیا، جس کے گلابی چمڑے کو بلیڈ سے لمبی لمبی لکیریں دے کر کاٹ دیا گیا تھا اور اس کی جھار سی بن گئی تھی۔ اب اس جوتے کو کسی ریسرچ کے لیے تو استعمال کیا جاسکتا تھا کہ اس کی ابتدائی شکل آخر کیا رہی ہوگی، لیکن پاؤں میں پہننے کے لیے ہرگز نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔
”اچھا جوتا تھا۔ لیکن زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ تم مارکیٹ سے نیا لے لیتا۔“

وہ تیزی سے اس سے آگے چلنے لگی، ورنہ آج اسے قاتل بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

”تم اب تک کہاں تھیں امرحہ دی مینڈکی۔“
ٹرنٹر۔ میں کب سے ہوں اس یونی میں۔ تم تب سے کیوں نہیں آئیں۔ اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ کیسے بے کار اور فضول گئے وہ سب سال۔ بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ لیکن اب تو تم یہاں ہی ہونا۔ مجھے وقت کو جمع اور ضرب دینا آتا ہے، اور دیکھو تمہاری جھنڈی بھی دو تیس ہیں اور بہنیں جیسا کہ میں نے سنا ہے ایشیا میں بہت بڑے بڑے خاندان ہوتے ہیں۔ یعنی جو تمہاری چھ سات، آٹھ دس بہنیں ہیں۔ ہاں جو بالکل تم جیسی ہیں، انہیں بھی ماچھنڈیلا لوسے اسی یونی میں۔ میں کچھ بھی کر کے فنڈز اکٹھے کروں گا، تاکہ انہیں آنے میں آسانی رہے۔ لیکن برائے مہربانی تم اپنے جیسی ایک ایک کاربن کاپی کو یہاں لے آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے مزے سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے دونوں میں کتاب بدل دوستی ہو۔ جی۔ پنجاب کی دو کتاب بدل دوستی کو میں نے ماچھنڈیلا کتاب بدل دوستی کا نام دے دیا ہے۔ ٹھیک کیا نا۔
امرحہ رکی اور شرارے اگلی آنکھوں سے کارل کو تارا۔

کارل بھی رک گیا اور بہت مزے سے امرحہ کو دیکھنے لگا، پھر اپنی ناک پر انگلی رکھ لی۔

”تم ایس مین سیریز میں کام کرتی رہی ہو کیا۔ یہ دیکھو۔ میری کھال جل کر پھٹ رہی ہے۔“

امرحہ نے کانوں میں ایر فون لگایا اور میوزک تیز

جی کارل۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کی تصویریں لے رہا تھا۔ بس آگ رہی نہیں دے رہی تھی وہ اسٹاپ پر صرف جرابوں کے ساتھ ننگے پیر کھڑی تھی۔ دوسرا جوتا تھا کہ میں پکڑ کر کھا تھا۔ اس نے کھور کر کچھ دور موجود کارل کو دیکھا۔ اس کے جی میں آئی کہ ہاں بس اب۔ اب اسے قاتل بن جانا چاہیے۔ اگر اب بھی نہیں بنے گی تو آخر کب بنے گی۔؟ کارل کا خون اس پر جائز تھا۔ اسے ساری زندگی اتنی کوفت اور شرمندگی نہیں ہوئی تھی جتنی یونی سے ایسے آتے اور پانچ منٹ بنا جوتوں کے ایسے کھڑے ہو رہی تھی۔ تیزی سے اپنی کلاس کے لیے بھاگتے اسٹوڈنٹس بھی گردنیں موڑ کر اسے دیکھنا نہیں بھول رہے تھے۔

گھر آئی جو تبدیل کیا۔
”کیوں آنکھیں اتنی جلدی؟ نشست گاہ میں ٹی وی دیکھتے بیڈی مرنے پوچھا۔
”میرا جوتا۔“ غصے کی شدت سے وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”کیا ہو جوتے کو۔ اوہ نوٹ گیا۔“
”ایک خنوس انسان ہے یونی میں، وہ لے گیا۔“
”وہ جیل گوا ہے کیا۔“ وہ ہمیں۔
”نہیں۔ ڈائن۔“
”ڈائن تو فی میل نہیں ہوتی امرحہ۔؟“

”وہ میل ڈائن ہے۔“ وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہی ہے وہ جو اس کے اور عالیان کے درمیان ایسی دوری کا باعث بنا ہے۔ یہ بات وہ اکثر خود کو سلی دینے کے لیے سوچ لیا کرتی تھی۔ اپنے کیے کا الزام دیر اور کارل پر ڈال دیا کرتی تھی، جبکہ ویر اور کارل سے زیادہ وہ خود قصور وار تھی۔

جب وہ یونی واپس آئی، اس کی پہلی کلاس ہو چکی تھی۔ باقی کی کلاسز لے کر وہ واپس جا رہی تھی کہ بندر کی طرح فلا بازیاں لگا تا وہ اس کے سامنے آیا۔
”یہ لو اپنا جوتا۔“

برنس اسٹوڈنٹ پر ایسا گھٹیا الزام کیسے لگایا جاسکتا ہے،
آخر کیسے۔

رات کو ویرا آئی اپنی ہنسی بولتی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے آئی فون اس کے آگے کیا،
وہاں اس کی بس اسٹاپ پر ننگے پیروں کھڑی تصویر تھی
اور ٹائٹل تھا۔

”ماچسٹریس سو سالہ سردی کا ریکارڈ ٹوٹنے پر دور
جید کی نینس منڈیلی کا احتجاج۔“

ویرا کا رپٹ پر پیٹ پکڑے کسی افغان بلی کی طرح
لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے اس
سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ پھینک کھانے کے
بعد آج وہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور ایسے لوٹ
پوٹ ہو رہی تھی۔ امرجہ ویرا کو دیکھ رہی تھی۔

شاید واقعی آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے۔
کارل پھر سے پہلے جیسا کارل بن گیا تھا تو عالیاں بھی
پہلے جیسا ہو ہی جائے گا۔

امرجہ فون ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی اور بس بیٹھی ہی
رہ گئی۔ کارل نے آدھی یونی کو اپنے پیس بک اکاؤنٹ
میں اس کی تصویر پر ٹیگ کر دیا تھا۔ امرجہ میں اتنی ہمت
نہیں تھی کہ آدھی یونی کے کمنٹس اس نارو وٹا یا پ
تصویر کے نیچے پڑھتی۔ اپنی ایسی مشککہ خیز تصویر دیکھ کر
ہی اس کی آنکھوں میں مرجھیں سی بھر گئی تھیں۔ اسے
رونا بھی آ رہا تھا اور ویرا کو دیکھ کر ہنسی بھی۔

ویرا پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور
غبارے چھوڑ اور پھوڑ رہی تھی۔ چینی پریڈ کے بعد
سے امرجہ مسکرا نہیں سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب
وہ تاعمر نہیں ہنس سکے گی۔ لیکن ویرا کی ہنسی جیسے اسے
اشارے دے رہی تھی کہ ”سب ٹھیک ہو جائے گا
پیاری۔ ایک نہ ایک دن آخر سب ٹھیک ہو ہی جاتا
ہے۔“

”تم جانتی ہو، ماچسٹریس تمہیں کیا تحفہ دیا ہے۔“
اپنی ہنسی کی چھنڈریل کو بمشکل روک کر ویرا بول پائی۔
”کارل۔۔۔ تمہیں کارل سے نوازا گیا ہے۔ خوش
قسمت ہو تم۔“

کر دیا۔ کارل کا قہقہہ اس کی پشت پر دیر تک فضا میں
منتشر رہا۔

بس میں بیٹھ کر اس نے ایسے وائٹ پروائٹ جمائے
جیسے ان وائٹوں تلے کارل کی گردن ہو۔۔۔ آ۔۔۔ خ
تھو۔۔۔ کیسا سوچ رہی تھی وہ۔۔۔

کاش میں بھی کارل جیسی ہوتی یا ویرا جیسی، پھر
اینٹ کا جوباب پھر سے دیتی۔ وہ دود و جنگ ہوتی۔

”اللہ جی میرے بھی ذہن میں کوئی ترکیب ڈال دیں
کہ اس کارل قال مثال کو ہی سب عطا کیا ہوا ہے۔“
کارل عالیاں سے متعلق دھمکی دے کر تقریباً
غائب ہی ہو گیا تھا۔ شاید وہ عالیاں کو ڈھونڈتا رہا تھا اور
جب عالیاں واپس آ گیا تو دوبارہ امرجہ سے اس کا ٹکراؤ
نہیں ہوا تھا۔ اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ اسے
لابریبری میں چھیڑ بیٹھا اور امرجہ نے پھر سے جیسے اسے
اپنے پیچھے لگو لیا۔

ویسے بھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اٹنے کام
کیے بنا اسے نیند آیا کرتی تھی نہ کھانا ہی کھایا جاتا تھا
اس سے۔ اس کے انسانی ڈھانچے میں سپر اسپرنگ
فکسی تھے جو اسے کسی بل چین سے رہنے نہ دیتے۔
یہ اسپرنگ اس قدر کارآمد تھے کہ دس قدم انسانوں کی
طرح چلنے کے بعد وہ گیارہویں قدم پر چھلانگ یا
چھلانگ نما چال ضرور اڑا لیتا۔

آتے جاتے اسٹوڈنٹس کے ہاتھوں سے کھانے کی
چیزیں اچک لیٹا تو اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا
کام تھا۔ یعنی وہ ہاتھوں سے برگر پکڑے، منہ کھولے
کھانے والا ایک بڑی سی مزے دار سی بائیٹ لینے کے
چکروں میں ہے اور جب وہ کترتا ہے تو اسے معلوم ہوتا
ہے کہ برگر تو ہاتھ میں رہا ہی نہیں۔ یعنی شاہد بن برگر
شکار کی طرف ہنس کر دیکھتے ہیں اور اشارے سے
بتاتے ہیں۔

”کارل!“

اب برگر شکار کارل کو بمشکل ڈھونڈتا اس کے پاس
جاتا ہے اور اسے شرم دلاتا ہے، تو اٹنا کارل اسے
انتظامیہ کے پاس جانے کی دھمکی دیتا ہے کہ آخر ایک

”تھک جاتی ہوں نا۔۔۔ مشکل ہے زندگی؟“
”مشکل تو ہے۔“ وہ دادا کو بتانہ سکی کہ کیا مشکل

”اگر مجھے نہیں بتا سکتیں تو سائی تو ہے نا۔“
 ”آب سائی سے پہلے ہی میرے لیے واوا۔“
 ”پھر بھی۔۔۔ کچھ رشتے ملتے بھی قریبی ہوں ان سے
 سب نہیں کہا جا سکتا۔“

وہ سانی کے پاس ہی گئی تھی۔ دادا سے وہ سب کہنا چاہتی تھی پر کہہ نہیں سکی۔

”تمہاری ماں اور داوی دانیہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن تمہارے ماموں نہیں مان رہے، کہتے ہیں شادی بہت دھوم دھام سے کرنی ہے، ابھی تم لوگوں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”یہ کیا بات کی انہوں نے داوی؟“

”یہ تو میں نے کہا تمہاری اماں سے کہ پوچھو اپنے بھائی سے، ہم کیا بھوکے مر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جا ہے۔ واجد کی دکان ٹھیک ہو رہی ہے۔ منافع آنے لگا ہے۔ وہ تمہارے دیے قرض کو جمع کر رہا ہے۔ خاندان کی ایک تقریب میں اس نے کسی سے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی میں فضول خرچی نہیں کرے گا۔ تمہارے ماموں کو اس بات کی خبر ہو گئی۔“

”مایا کہا کتے ہیں دادا؟“

”واجد کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے فضول پیسے ہیں ہی نہیں، پہلے کی بات اور تھی، اب جو کچھ تھا تھا، وہ سب دکان میں لگ گیا۔ واجد نے برا وقت دیکھا ہے۔ کسی نے اس بڑے وقت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ خاندان میں کسی نے قرض کے نام پر چند ہزار بھی نہیں دیے۔ واجد بہت بد دل سا ہو گیا ہے سب سے۔ مشکل ہے یہ مفتی رہے۔ واجد نے تو اشیاء سے یہ تک کہہ دیا ہے کہ وہ روڑھنے کے کیے تمہارے پاس چلی جائے ہوئی رہے گی شادی سال دو سال میں۔ امرجہ واجد کہہ رہا تھا کہ اس کا وہی سکھ اس کے کام آیا، جسے اس نے اور خاندان والوں نے کھوٹا سمجھ

کھلی کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا نے امرحہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اب۔۔۔ ہاں اب۔۔۔ اسے یہ ہوا نرم لگی۔۔۔ سرگوشیاں کرتی۔۔۔ اس کے دل کو تھوڑا قرار سا پایا۔۔۔ سکون کی ایک لہر اٹھی۔

”اچھڑی میں تعلیمی دورانیے سے متعلق جو
 وزیر، ہم لکھ رہے ہیں تا امر کہ اسے سب ایک طرف
 ہوں گی، لیکن جو ایس تمہاری اسٹوڈنٹ ڈائری میں
 رقم ہوں گی تا وہ نوبل انعام و ننگ ہوں گی۔ تم اپنے
 پوتے، پوتیوں کو ہنسا کر مار ڈالو گی۔ ہر طرح کی یادوں
 سے تم مالا مال ہو چکی ہو۔ کتنی خوش قسمت ہو تا تم
 مقناطیس کی طرح تم اپنی طرف کھینچتی ہو کہ آؤ۔ مجھے
 تار، رلاؤ۔“

ہنتے ہنتے دیر اکو پھندا لگ گیا تو امرجہ نے جھک کر اس کی کمر میں زوردار گھونسا مارا۔ دیر امانہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی کہ کیوں مارا۔ وہ بھی اتنی زور سے۔۔۔

”کچھ تمہاری ڈائری میں بھی لکھا جانا چاہیے تھا۔ میں تمہارے پوتے، پوتلیوں کو بور ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“ امرجہ نے معصومیت سے کہا۔ ویرانے اس کے بال مٹھیوں میں بھر لیے اور اس کے سر کو جھٹکے دینے لگی۔ یہی کام امرجہ نے کیا۔ دونوں کا ہینٹ پلوٹ بوٹ محترم گتھا ہو گئیں۔

”میرے پوتے پوتیاں بور نہیں ہوں گے۔ میں انہیں تمہارے قصے سننا کر ہنسا ہنسا کر خوش گفتار گریزند رہنے کا خطاب حاصل کر لوں گی۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ چیکے رہا کریں گے کہ گریزندیاں بلیز اس امر جدی لاسٹ ڈک کی بائیں سنائیں نا۔“

Ball "میں بھی تمہارے قصے سنایا کروں گی۔"
Ginger فکر نہ کرو۔"

”مانچسٹر کے راج ہنس! تم نے مسکرا نا کم کر دیا ہے یا کفایت کر رہی ہو؟“ وادا پوچھ رہے تھے بہت بار پوچھ چکے تھے۔

کہا اور سالی کے پاس آئی۔ جوتے والے قہے کے بعد اس نے لاکھ ذہن لڑایا، لیکن کارل کو مزا چکھانے کی کوئی ایک بھی ترکیب نہیں سوچ سکی۔

”مجھے مشورہ دو۔“ سالی کو ساری بات سن کر اس نے مشورہ مانگا۔ ”تھوڑا بہت بدلہ تو جم سے بھی لیا جاسکتا ہے۔“ سالی ہنسنے لگی۔

”ہنستے ہوئے تم بالکل میرے دادا جی جیسے لگتے ہو۔“

”کیا تمہارے دادا میرے جیسے جوان ہیں یا میں ان جتنا بوڑھا ہوں۔“

”ہنستے ہوئے تم ان جیسے معصوم اور سادہ لگتے ہو۔“

امرحہ نے ہونٹ میٹھے۔ وہ سالی کے مشورے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آخر اسے جم کا خیال کیوں نہیں آیا۔ گوائنٹ کا جواب پتھر تو ہرگز نہیں تھا، لیکن اینٹ کا جواب کچھ تو تھا، وہ بھی صرف پانچ پونڈ میں۔

امرحہ جم کے پاس جائے، پہلے ہمیں اس کی تاریخ تک جانا چاہیے۔

تو جم کی تاریخ کچھ یوں تھی کہ وہ اکثر کلاس میں اوگھتا ہوا پایا جاتا تھا۔ اب پوری یونی میں وہ اکیلا تو نہیں تھا جو یہ کرتا تھا۔ کم و بیش یونی کا ایک ایک اسٹوڈنٹ اپنے پوری تعلیمی سال میں چالیس سے پچاس بار اس عظیم سانحے سے ضرور گزر رہا۔ کچھ اس سانحے سے زیادہ گزرتے۔ کچھ کم، لیکن فیض یاب سب ہی ہوتے۔

کچھ کلاس میں اوگھتے پائے جاتے۔ کچھ ہرجگہ اور بہت سے کسی بھی جگہ۔ مطلب کسی بھی جگہ۔

آپ بس میں بیٹھے ہیں، آنکھ کھلی۔

”وہ میں تو بہت آگے آگیا۔“ جلدی سے بس

بدلی۔ بس چلی۔ آنکھ پھر سے لگی۔

”اوف میں تو بہت پیچھے آگیا۔“ پہلا لیکچر گیا۔

جولی کافی لینے گئی ہے۔ جولی واپس نہیں آئی۔ جولی

کافی کے مک جو بعد ازاں ایک ہوش مند رحم دل

اسٹوڈنٹ نے صرف اس خیال سے اٹھا لیے ہیں کہ

کافی ٹھنڈی ہو کر بے کار ہو جائے گی اور جولی کو سوتے

لیا تھا۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں۔ بار بار میرے پاس آتا ہے۔ کہتا ہے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوتی رہی۔“

امرحہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تو بابا کو احساس ہو گیا۔“ وائے کیا کرتی ہے۔“

”صاف کہہ دیا ہے اس نے مراؤں گی کسی

دوسرے ملک نہیں جاؤں گی۔ وہاں بڑھو بھی کام بھی

کرو، کیا ضرورت ہے اتنے دیال پالنے کی، مجھے کون سا

منسٹر فنانس کی ملک کا۔“ یافون پر لگی رہتی ہے یا سوتی

رہتی ہے۔ اتنی آرام دہ زندگی چھوڑنے کی اسے کیا

ضرورت ہے بھلا۔“

آرام دہ زندگی تو امرحہ کی تھی۔ زندگی کی روح کام

ہے۔ صرف کام۔ چلتے رہتا۔ حرکت میں رہتا۔ علم

کے کام میں مصروف۔ عمل کے کام میں مصروف۔

اتنی سی زندگی میں انسان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں

ہے کہ ضائع کرتا پھرے۔ سو کر۔ رو کر یا موج مستی

میں۔

یہ زندگی انسان کو بھلائی کے کام کرنے کے لیے عطا

کی گئی ہے۔ خیر اکٹھا کرنے کے لیے اسے کھیل

تہاشے کی نظر نہیں کیا جاسکتا۔ شفاف، میٹھا پانی بھی

ٹھہر جائے تو بدبو دینے لگتا ہے۔ کچھ میں بدل جاتا ہے،

انسان کیوں کر خود کو ٹھہرا کر برباد کر سکتا ہے۔ کائنات کی

ہر شے۔ ہر شے ہمہ وقت حرکت میں ہے اور

تاقیامت رہے گی۔ انسان ساکن ہو کر گناہ کبیرہ کا

مرتب کیے ہو سکتا ہے۔ یہ تو انسانی رتبے کے منافی

ہے۔ سراسر منافی۔

”ہنتی رہا کرو امرحہ! تمہاری خاموشیاں اتنی گہری

کیوں ہوئی جاری ہیں؟“ دادا کو ایک بس اس کی ہی فکر

تھی۔

امرحہ نے دادا کو ہنس کر دکھادیا۔ ٹھیک اسی وقت

کارل اس کے قریب سے استہزائیہ ہنس کر گزرا۔

اس کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ابھی تمہاری یہ

ہنسی بھی غائب کر رہا ہوں۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔

امرحہ کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ دادا کو اس نے بائے

”اوسے آپ سمجھے نہیں، میں آپ کو ہسانا چاہ رہا تھا۔“ مزید سختی سے آنکھیں ملے ہوئے۔
”ویل۔ تمہارے جیسے دو تین پہلے ہی مجھے بہت ہنسائے ہیں۔ مجھ میں مزید سکت نہیں رہی ہونے کی۔ اب یہ کام تم اپنے پروفیسر زاور پونی ڈین کے ساتھ جا کر کرو۔“

”آپ برامان گئے، میرا مقصد تو محض تفریح تھا۔“
”میں اس طرف دائیں رخ کھڑا ہوں اور میرے کافی مگ پر سے بھی ہاتھ اٹھاؤ۔ یہ بھی ایٹو نہیں ہوگا۔“

اب جیکب لائبریری آیا ہے۔
”مجھے میری مطلوبہ کتابیں نہیں مل رہیں۔“
”میں گئی بھی کیسے، ہم کینٹین میں کتابیں نہیں رکھتے۔ ڈین کا آرڈر نہیں ہے نا۔“

زونی کینٹین گئی ہے۔
”ایک ونڈا کوک۔ نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے کریم کافی لے لینی چاہیے۔ ایک کریم کافی۔“
”تھیک ہے۔ کتابوں کی الماریوں میں ڈھونڈ لو۔“
”ونڈا کوک اور ایک کریم کافی میرے لیے بھی۔“
جانسن اپنے دوست کی کریمیں زوردار گھونسا مار کر کھتا ہے۔

”تم نے مجھ سے بیس پونڈ لیے تھے، میرے مرنے کے بعد واپس کرنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں۔ ایگز امز میں تمہارے پیپرز چیک کرنے کے بعد۔“ پروفیسر ولیم کی آواز گونجتی ہے۔ کوریڈور جو پروفیسر کو گھونسا کرنے پر سکتا سا ہو گیا تھا۔ فلک شگاف تمبھوں سے گونج اٹھتا ہے۔ وہ بے چارے جانسن کا اب کیا ہو گا۔ خدا اوجھے اس نیند سے۔

تو ہمارا جہان دو سری قسم والوں میں سے تھا۔ بے چارے پروفیسر کا ماننا تھا کہ وہ رات بھر آوارہ گردی کرتا ہے اور پھر ان ہی کی کلاس میں ایسے اونگھتا ہے جیسے ان کا لیکچر اس قاتل ہی نہیں کہ اسے سنا جائے۔ یہ تو سراسر بے عزتی ہوتی نا۔ جبکہ جم جاب کرتا تھا اور رات گئے تک پڑھتا، آوارہ گردی کا تو اس کے پاس

سے اٹھادینا تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ بے چاری سوہی تو رہی ہے نا اور سوتے ہوئے لٹنی پیاری بھی تو لگ رہی ہے۔ خیر جولی کینٹین کاؤنٹر سر رکھے اونگھ رہی ہے اور کاؤنٹر مین اس پر پانی کے پھینچنے بھی مار چکا ہے۔ لیکن جولی بدستور اونگھ رہی ہے۔ کاؤنٹر کی طرف آتے کسی مہمان نے اس کے کھلے منہ کی تصویر لے کر The Tab بھیج دی ہے۔

یعنی پونی کے باغوں میں درختوں تلے کلاس کے دوران، کوریڈور میں ہاتھ رومز، واش رومز، ٹیوب مارز، کیفے، ریسٹورنٹ، لائبریری میں تو خاص کر اور کینٹین میں تو ضرور ہی۔ کون تھا جو منہ کھول کر اونگھتا پایا نہیں جاتا تھا۔ ایگز امز کے دنوں میں تو ٹیبل اور کرسیوں کے نیچے بھی مور تو اور کوزا دان کی آڑ میں چھپ کر بھی۔

جب کوئی اس اونگھ سے محفوظ نہیں تھا تو سزا صرف ایک جم کو ہی کیوں۔ اور وہ تو تھا بھی دو سری قسم والوں میں سے۔

پہلی قسم آنکھیں بند کر کے قدرتی اونگھ لینے والی۔ دو سری قسم آنکھیں کھول کر خود پر جبر کر کے غیر قدرتی اونگھ لینے والی۔ دو سری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے تعلیمی ریکارڈ کو بہتر بنانے کے لیے اور ایک اچھے اسٹوڈنٹ کا خطاب پانے کے لیے آنکھیں میچ کر نہیں انہیں کھول کر سوتے ہیں۔ جی ہاں۔ ایسا ممکن ہے۔

مارٹن لائبریری سے کتابیں ایٹو کر رہا ہے۔
”برائے مہربانی ذرا جلدی کریں اور مجھے یہ ایٹو کروں۔“ ہاتھ کو کتابوں پر رکھتے ہوئے۔

”یہ میرا ہاتھ ہے۔“ لائبریرین۔
”اوسے میں مذاق کر رہا تھا۔“ آنکھیں مسل کر۔
”یہ رہیں میری تین کتابیں۔ انہیں ایٹو کروں۔“

”معذرت کے ساتھ۔ یہ لائبریری کی ملکیت ہے۔ ہم اپنے زیر استعمال کمپیوٹر اور دیگر مشین ایٹو نہیں کر سکتے۔ آپ کو صرف کتابیں ہی ایٹو کی جاسکتی ہیں۔“

وقت ہی نہیں تھا۔ ایسے میں بے چارہ کبھی کبھار کلاس میں اونگھنے لگتا تھا۔

اسی معاملے کو لے کر دونوں کے درمیان سرد جنگ سی شروع ہو گئی۔ اب وہ مکمل ہوش و حواس میں بھی ہے تو پروفیسر پارکراسے ایسے دیکھتے ہیں جیسے کہتے ہوں۔

”ہاں۔۔۔ ہاں اونگھ لو جم چوزے۔۔۔ میں لوری ہی تو سنا رہا ہوں۔۔۔ چلو ورنہ کرو اور اونگھ لو۔“

اس خاموش، سرد، طنزیہ جنگ سے تنگ آکر ایک دن جم باقاعدہ خراٹے لے کر اونگھنے لگا۔ اسے جھنجھوڑنے کے بعد پروفیسر پارکراسے جن نظروں سے دیکھا۔ اس کا بی چاہا کہ گریجویشن کرنے کے اپنے خواب کو آگ لگائے اور گھر چلا جائے۔ لیکن پھر اس نے ہمت کی اور اپنے اور پروفیسر کے درمیان کی سرد جنگ کو ختم کرنا چاہا، لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ پھر اس نے ایک عملی صورت اختیار کی کہ پروفیسر کو سمجھا سکے کہ ایسی طنزیہ اور سرد جنگ ایک اسٹوڈنٹ کے ساتھ رواں رکھنے سے کتنے تکلیف ہوتی ہے۔ اس نے پورے پانچ دن پروفیسر کو دیکھنے میں گزارے۔

پروفیسر پارکراسے گز رہے ہیں۔ اپنی کلاس لینے جا رہے ہیں، جم ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھے ان کے ساتھ ساتھ چلتے انہیں اس افریقی قبائلی کی طرح دیکھ رہا ہے جو یورپ کی گوری میوں کو دیکھ کر منہ بند کرنا اور آنکھیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔

جم مکمل سنجیدہ ہے۔ جم خاموش گھور رہا ہے۔
”What“ پروفیسر پارکراسے پوچھ رہے ہیں۔
نوجواب۔۔۔ بس گھورنا۔۔۔ مسلسل گھورنا۔

پروفیسر پارکراسے باہر آ رہے ہیں، جم ساتھ ساتھ گھورتا جا رہی ہے۔ گردن کا زاویہ ایک سانس جیسے سنجے میں کس دبا گیا ہو، عین پروفیسر کے منہ کی سمت نہ کم ادھر نہ زیادہ ادھر۔

پروفیسر اپنے آفس میں بند، آفس کے باہر جم کھڑا ہے۔ پروفیسر اچھی کلاس کے لیے آفس سے باہر جم

ساتھ۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ استقامت سے۔۔۔

پروفیسر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی بھگالے گئے ہیں۔ اگلے دن پارکنگ میں جمع پھر سے موجود ہے۔ گردن کا ٹھیک وہی زاویہ نہ کم نہ زیادہ۔ بالکل زومبی کی طرح۔

پروفیسر پارکراسے انتظامیہ سے رابطہ کیا۔ انتظامیہ نے جم سے۔

”وہ میرے پروفیسر ہیں، مجھے ان سے پار ہے، میں انہیں دیکھ سکتا ہوں، یہ کوئی قابل اعتراض بات یا جرم نہیں ہے۔“

”واقعی یہ کوئی جرم نہیں تھا۔“ انتظامیہ ٹھنڈا سانس ٹھہر کر رہ گئی۔ پروفیسر نے دو دن کی چھٹی لی۔ تیسرے دن آئے۔۔۔ جم پھر سے پارکنگ سے ان کے ساتھ۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے تم؟“ پروفیسر پارکراسے کے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔

جم خاموش۔۔۔ گھورتا جا رہی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ۔۔۔ سائے کی طرح۔۔۔ اللہ ایسی کڑی آزمائش سے بچائے۔۔۔ دنوں میں پروفیسر پارکراسے جم یونی میں مشہور ہو گئے۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس سے اسٹوڈنٹس آ رہے ہیں، یہ تماشا دیکھنے، تقریریں لے رہے ہیں۔ ویڈیو بنا رہے ہیں۔ گروپ کی صورت اسے زیر بحث لا کر گفتے لگا رہے ہیں۔ لیکن جم خاموش ہے۔ سنجیدہ ہے اور اپنے کام سے لگا ہے۔

تو کوئی ہفتے بعد جم نے پروفیسر پارکراسے کی جان چھوڑی۔ ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس کے بعد پروفیسر پارکراسے میں یہ معلوم کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی ہوگی کہ ”آخریہ خراٹوں کی آواز آگیاں سے رہی ہے۔“

نیا نیا جم اور پروفیسر پارکراسے کا واقعہ ہوا تھا تو ایک لوکا جم کے پاس آیا اور اسے پانچ پونڈ دے۔ ”جو پروفیسر کے ساتھ کیا ہے وہی مسزینڈ آف اسٹیون کے ساتھ بھی کرو۔“ جم نے پانچ پونڈ رکھے اور ایک دن کے لیے مسزینڈ آف اسٹیون کے پیچھے ہو گیا۔ آہستہ آہستہ جم

ڈیڑھ سو پونڈ کے لفظ پر جم نے اسے بڑے غور سے دیکھا کہ ”میں! اتنے پیسے خرچ کر سکتی ہوں۔ ہارٹ فیل نہیں ہوتا تمہارا؟“

امرحہ نے جوتے کی قیمت حسب زنانہ عادت دہرا چڑھا کر بتائی تھی۔ ورنہ وہ دور دور تک اتنے کا نہیں تھا۔ اتنے کا ہوتا تو امرحہ کی پیچھے سے دور ہی رہتا۔

جم نے سر ہلادیا، یعنی ہاں۔ ”ویسے امرحہ کا دل بیس پونڈ بھی کھچ لینے کو چاہ رہا تھا۔ پر کارل پر وہ اتنے پیسے لگانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی دو کلاسز لینے کے بعد امرحہ کا دل کارل کا حال دیکھنے کے لیے چلا۔ وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اسے آرٹ اسکول کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ کارل کا آرٹ اسکول میں کیا کام، یعنی جم بھی وہیں ہوگا۔ جب وہ آرٹ اسکول داخل ہوئی تو کو ریڈور میں اسے تین لوگ نظر آئے۔ کارل۔ جم۔ آنا۔ آنا جم کی منگیتر ہے۔

اف وہ کارل تھا۔ امرحہ اسے ہرا نہیں سکتی تھی۔ منظر کچھ یوں تھا کہ جم اپنے انداز میں گردن کو کارل کی طرف فکس کیے گردو پیش سے بے گانہ ہوئے، گھور رہا تھا اور ٹھیک جم کے ہی انداز سے کارل جم کی بھولی بھالی، سرخ گالوں والی پیاری سی منگیتر آنا کو گھور رہا تھا۔

اب جہاں جہاں آنا وہاں کارل اور ساتھ جم آتے جاتے سب اس ڈرامے کو دیکھ رہے تھے بلکہ جاتو کوئی نہیں رہا تھا۔ پلٹ پلٹ کر واپس آ رہے تھے دیکھنے کے اس براہ راست شو کا کیا اینڈ ہوتا ہے۔ آنا خون خوار نظروں سے جم کو گھور رہی تھی، ساتھ اسے کھری کھری سنارہی تھی۔ اسے دھمکی دے رہی تھی۔

”میں نے کہا جم بند کرو، اپنی یہ فضول حرکت ابھی۔“

”جم! ابھی کوئی رد عمل نہیں۔“

”جم! اگر تم نے ابھی کے ابھی یہ سب فضولیات نہیں چھوڑیں تو میں بہت برا کر گزروں گی تمہارے ساتھ۔ جم۔“ آنا چلائی۔

جم ہنوز اپنے کام میں مصروف۔

کی خدمات دوسرے اسٹوڈنٹس نے بھی حاصل کرنی شروع کر دیں تو جم نے کچھ اصول وضع کر لیے۔ اب جب کام کرنا ہی تھا تو ذرا طریقے سے کر لیتا چاہیے تھا۔

ایک دن کے پونی کے صرف پانچ پونڈ۔ بس، یوب سے شکار کے پیچھے پیچھے رہائش گاہ تک دس پونڈ۔ درمیان میں دو گھنٹے کا بریک۔ رات اور چوبیس گھنٹے کے بیس پونڈ۔ یعنی شکار کے پیچھے پیچھے جم بازاروں، گلیوں، ریسٹورنٹس، شاپنگ سینٹر تک جائے گا۔ صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھ کر۔ زومبی۔ اسٹائل میں گردن کو ایک ہی زاویے پر اکڑائے جم از گھورنگ۔

زیادہ تر صرف پونی کا ہی بھی کھچ لیتے۔ بہت کم دوسرا بیس پونڈ کا بھی کھچ بھی لیتے۔ جم کے فن کے دوسرے رہنما اصول۔

”اسے رشوت نہیں دی جاسکتی، بے شک شکار اسے اپنا کریڈٹ کارڈ پکڑا دے یا پچاس ہزار پونڈ ہاتھ سے دے۔“

شکار کا کوئی قصور ہونا ضروری ہے۔ معصوم لوگوں کو وہ تنگ نہیں کرے گا اور اگر بعد ازاں ثابت ہو گیا کہ شکار معصوم تھا تو اسے پانچ پونڈ دینے والے کے ساتھ وہ یہی سب مفت کرے گا۔ تو جب جم ڈیوٹی دیتا تو پونی میں قہقہے بلند ہوتے۔

”جم از آن بزورک (جم اپنے کام پر)۔“

مشن از بیلا۔ ڈیپارٹمنٹ ہیالوجی۔ عمر بیس سال۔ انتہائی تیز طرار بد تمیز نمک مرچ لڑکی، قصور۔ اپنی کلاس فیلو روزلین کے لیے قدر پر بھیتیں کسنا اور اسے مسز ایفل کے نام سے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور کر دینا۔

ہاتھ میں پانچ پونڈ لے کر امرحہ جم کی پاس آئی۔ کارل، بزنس ڈیپارٹمنٹ، بد تمیز، انتہائی بد تمیز، میرے ہاتھ سے کتابیں چھین کر لے گیا، پھر انہیں ضائع کر دیا۔ مجھے بھاری جرمانہ بھرتا پڑا۔ پھر میرا جوتا کٹ دیا۔ پورے ڈیڑھ سو پونڈ کا تھا میرا جوتا۔“

کارل یا گلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا مانچسٹر یونی کو انگلی پر فٹ بال کی طرح گول گول گھما کر اپنی فتح کا واضح اعلان کرے اور کہے کون ہے جو مجھے زنج کر سکے۔



مانچسٹر یونی اسٹوڈنٹ سوسائٹی اور چند دوسرے ملکوں کے اسٹوڈنٹس کی سوسائٹیوں نے مقامی برطانوی خاندانوں سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ ان ملاقاتوں کا مقصد ایک دوسرے کے معاشرے، رسم و رواج، تاریخ، عادات و اطوار، رجحانات وغیرہ کے بارے میں جاننا تھا۔ ایسی ملاقاتیں قرمت کا باعث بنتی ہیں۔ دوریاں کم ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

امرحہ نے اپنا نام دائم کو پہلے سے ہی دے دیا تھا اور امرحہ کو اوکے کر دیا گیا تھا۔ مختلف ملکوں کے اسٹوڈنٹس کا بیس رکنی گروپ مسٹر اینڈ مسز پاول کے گھر پہنچ گیا جہاں پاول خاندان کے ساتھ دو اور خاندان موجود تھے۔ مسٹر اینڈ مسز اینڈ امرحہ اور مسٹر اینڈ مسز گڈل اور ران تین خاندانوں کے چار عدد شراری اور ایک سکیئنڈ میں ساٹھ سوال پوچھنے جیسے نیچے۔

ملاقات کے لیے لان میں نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ دھند سے اٹے لان میں کولے کی دو بڑی بڑی انگلیٹیاں رکھی گئی تھیں۔ اس کے چار اطراف نشستیں لگائی گئی تھیں۔ پھولوں کے گلے تے جا بجا رکھے گئے تھے۔ بھالوے سفید کتے بھی ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ گھر کی عمارت دھند میں لک چھپ جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی جزیرے پر آچکے ہوں۔ انہیں اتنے اچھے خیر مقدم کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ امرحہ کے پاس صوفے پر ایک نو سالہ بچی اسکرٹ میں ملبوس بیٹھی تھی اور امرحہ حلف اٹھانے کو تیار تھی کہ بچی بہت ہی معصوم نظر آرہی تھی۔

”تم کس نسل سے ہو؟“ یہ اس کا پہلا سوال تھا وہ

غصے اور شرمندگی سے آتا کے گال اور کان اور سرخ ہو گئے۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی سب انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ جب کارل کے پیچھے پڑا تھا تو بدلے کے طور پر کارل جم کی مگلیتر کے پیچھے۔

آٹانے غصے سے اٹھتے ہوئے جم کے ہاتھ پر زور دار چٹکی بھری، جمال ہے جو جم نے سی بھی کی ہو۔

”یعنی تم میری بات نہیں مانو گے۔“ اب آتا بے چاری کی آواز ٹھیک ٹھئی۔ امرحہ کی قسمت ہی خراب کیا ضرورت تھی جم کو یونی میں اپنی مگلیتر رکھنے کی۔ اس طرح بزنس تو نہیں ہوتے نا۔ اس کے پانچ پونڈ ضائع گئے۔ کارل کو کیا کوفت ہوئی، الٹا جم کوفت کا شکار ہو رہا ہو گا نا، رہی اندر۔ اب پانچ پونڈ کے لیے وہ اپنی سویت ہارٹ کو ناراض تو نہیں کرے گا یقیناً“

اور پھر کوریڈور میں موجود اسٹوڈنٹس نے دیکھا کہ چندرہ، بیس منٹ تک مزید جم کو بے نقط سنانے اور نم آنکھیں رکڑنے کے بعد بھی جم کے انسہاگ میں فرق نہ آیا اور وہ مکمل توجہ اور ایمان داری سے ڈیوٹی ہی کرتا رہا تو آرٹ اسکول کی سب سے خوب صورت لڑکی آٹا نے انگلی سے انگوٹھی اتار کر جم کی جیب میں ڈھولس دی۔

”بیٹا ٹھیک کہتے تھے، تم انسان کے نام پر ایک بن مانس ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

سوں سوں کرتی آتا چلی گئی۔ سب تو یہ توقع کر رہے تھے کہ آتا جم کو ایک پچھڑے نوازے کی، لیکن وہ تو اسے بن مانس ثابت کر کے جھوڑی گئی تھی۔

امرحہ دور سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ کارل زیر لب ہنسا ہے۔ امرحہ پاؤں پختی وہاں سے چلی آئی۔ کیونکہ جم آخر کار سوں سوں کرتی آتا کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اگر دادی یہ منظر دیکھ لیتیں تو جم اور آتا کے پاس جاتیں اور کہتیں۔

”بیٹا جم! مل گیا سبق۔ اب اس امرحہ سے دور رہنا۔ کہو تو میں تمہیں اس کی مسٹری شیٹ سنا دوں۔ لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے ساتھ جو ہونا تھا وہ تو ہچکا اور کافی برا ہو چکا۔“

ہے۔ ایشیا میں ریڈ انڈینز کے جینز نہیں ملتے۔
 ماشاء اللہ جس بارے میں امرج پہلی بار سن رہی
 تھی تو سالہ بچی اس پر تحقیق بھی کر چکی تھی۔
 ”بس میں تو ریڈ انڈین ہی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم
 کہ تمہاری ریسرچ کیا کہتی ہے اور تم بھول رہی ہو
 تمہارے بڑے سو سال تک ہندوستان رہے ہیں۔ ایسا
 ہونا ممکن ہے۔“

”میرے بڑے رے ہیں، لیکن ریڈ انڈینز نہیں۔
 تم مجھے اپنی رپورٹ دکھا سکتی ہو۔“
 ”وہ پاکستان میں ہے۔“ امرج کو یقین تھا کہ بچی کو
 ماننا ناممکن سا تھا۔

”تم اپنے خاندان سے کب تو تمہیں میل کر دیں۔
 میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“
 ”میں اپنے سب کام خود کرتی ہوں۔ اتنے معمولی
 سے کام کے لیے بھی میں اپنے خاندان والوں کو زحمت
 دینا نہیں چاہی۔“ امرج تو ایک جھوٹ بول کر چھٹس
 گئی۔ بھلا کہہ دیتی مجھے نہیں معلوم میں کس نسل سے
 ہوں۔

بچی شک سے اسے دیکھتی رہی اور اگلا سوال اس
 کے منہ سے نکلتے دیکھ کر امرج نے انگلی سے اسے
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کورین لڑکے کی طرف
 اشارہ کیا جو کسی ایک مسز کی فرمائش پر اپنا دبی گانا
 سناتے جا رہا تھا۔ ایڈم خاندان کے گیارہ سالہ چیری نے
 گٹار بجایا۔ ساتھ وہ سب چائے کے ساتھ فٹش اینڈ
 چپس کا رخ پائی کھاتے رہے۔ برطانوی لوگوں کو پانی کی
 منت ہی لسمیں بہت مرعوب ہوتی ہیں چائے تو ویسے
 ہی ان کا مشروب ہے۔

کورین کا گانا ختم ہوا تو انہیں ایسٹر برنت نئے انداز
 سے پیٹ کیے جانے والے انڈوز کے بارے میں بتایا
 گیا اور نوکری بھر کر انڈے ان کے آگے پیش کیے
 گئے۔ انہیں کچھ خاندانی البمز دکھائے گئے۔ ساتھ
 انہیں موقع دیا گیا کہ ان کے خاندان، رہن سہن اور
 دیگر باتوں کے بارے میں وہ سب سوال جواب کریں۔
 اس دوران ڈی این اے بچی مسلسل امرج کا جائزہ لیتی

اتنی معصوم تھی۔
 امرج نے تم کس شہر سے ہو۔ کس مذہب، کس
 ذات کی ہو، جیسے سوالات تو سننے تھے یہ کسل والا سوال
 اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

”میں پاکستان سے ہوں۔ پاکستانی مسلمان
 ہوں۔“ امرج نے گڑبڑا کر ادھر دیکھا کہ کوئی اور تو
 ان کی گفتگو نہیں سن رہا۔ وہ کیا گھوڑا تھی جو اپنی نسل کا
 اتنا پتا رکھتی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، میں نے تعارف میں سن لیا تھا۔
 میں نسل کا پوچھ رہی ہوں۔“
 ”تم کس نسل سے ہو؟“ امرج خاک نہ سمجھی۔ النّا
 اس سے ہی پوچھ لیا۔

اس کا منہ بن گیا۔ ”میرے سوال کا جواب تو دیا ہی
 نہیں، میں نے ابھی اپنا ڈی این اے نہیں کروایا۔
 لیکن مجھے شک ہے کہ میں ریڈ انڈین نسل سے
 ہوں۔“

”اوہ مجھے یاد آگیا۔ میں بھی ریڈ انڈین۔ نسل سے
 ہوں۔“

”تم نے اپنا ڈی این اے کب کروایا تھا۔ کس عمر
 میں؟“ بچی جو ہمیری پورٹر کی خالہ تھی نے شک سے
 اسے گھورا۔

”دو سال پہلے۔“
 ”تم ریڈ انڈین نہیں ہو سکتیں۔“ بچی نے باقاعدہ
 اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی ایس ریز پتلیاں گاڑ
 کر یقین سے کہا۔
 ”کیوں نہیں؟“

”تم اپنی بھنوں کی بناوٹ دیکھو۔ تم سکندر کی
 نسل سے ہو سکتی ہو، لیکن ریڈ انڈینز سے ہرگز نہیں،
 میرا مشاہدہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔“

امرج گھوم کر رہ گئی۔ ”بھنوں سے کیا ہوتا ہے۔
 میری رپورٹ یہی کہتی ہے کہ میں ریڈ انڈین نسل سے
 ہی ہوں۔“

بچی نے اپنی پتلیوں کے ایکس ریز تیز کر دیے۔ ”تم
 ہو ہی نہیں سکتیں۔ میں نے بہت ریسرچ کر رکھی

مراد ہماری برصغیر ہوتا ہے۔ تم لوگ ہمیں پور پڑن کتے ہو۔ ہم نہیں چڑتے، جبکہ برطانیہ اور امریکہ میں بھی کبھی ایسا ہی ماحول تھا جیسا انڈیا اور پاکستان میں ہے۔

ہندوستان سے مراد ایک خطہ ہے جو بلاشبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے یورپ میں ”جاو نگر“ کہا جاتا ہے۔ میرے رشتے کے چچا جب اپنے کاروبار میں دیوالیہ ہو گئے تو انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا۔ پہلے وہ بنارس گئے اور پھر سندھ۔ واپسی پر ان کا کہنا تھا کہ ان شہروں کے سفر نے انہیں پاگل ہونے سے بچالیا۔ بنارس میں وہ سادھوؤں کے ساتھ وقت گزارتے رہے اور سندھ میں بیروں بقیہوں کے ساتھ۔“

امرحہ خاموش ہو گئی اور مسز ایڈم کے پوچھے گئے سوال کے بارے میں سوچنے لگی۔ امرحہ کو ڈر تھا کہ اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا اور وہ پوچھ لیا گیا۔

”ایسا نہیں ہے۔ جہاں تعلیم اور سوچ کی کمی ہے۔ وہاں یہ سب ہوتا ہے“ اسلام نے تو سختی سے لڑکا لڑکی کی مرضی پوچھنے کا حکم دیا ہے۔ معاملہ کوئی بھی ہو اسلام جبر کا مخالف ہے۔ جبر کی کوئی گنجائش نہیں اسلام میں۔“

”اور یہ جو غیرت کے نام پر قتل کیے جاتے ہیں۔“

لندن میں ایک پاکستانی لڑکی کو اس کے باپ اور بھائی نے مار کر تے خانے میں دیا تھا۔“ مسز ایڈم بولیں۔

امرحہ کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

”جس نے ایک انسان کا قتل کیا، وہ کل انسانیت کا قاتل ہے۔ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے۔ زور زبردستی کی کوئی گنجائش نہیں، تو قتل کی کیسے ہوگی، وجہ کچھ بھی ہو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اسلام کے دائرے سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے ذہنی جنون ہیں، ہمارا مذہب، ہمارا قانون، ہمارا معاشرہ نہ اس کی اجازت دیتا ہے، نہ ہی تعلیم یہ ایسے گناہوں کے خود ذمہ دار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ خود کو مسلمان کہلاتے ہیں، ایک اچھا مسلمان ہر حال میں وہی کرتا ہے جو چودہ سو سال پہلے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ نہ تم نہ زیادہ، ٹھیک ٹھیک وہی۔ ہم سب بھی ایسے لوگوں کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں، جتنا آپ لوگ کرتے

رہی کہ وہ کیسے ہنس رہی ہے، کیسے کھا رہی اور کس قسم کے سوالات پوچھ رہی ہے۔ اس نے چپکے سے امرحہ کی ایک تصویر بھی لے لی۔

یقیناً ”امرحہ کی یہ تصویر اس کی ذاتی رہسریچ گاہ۔ اس کے اساتذہ اور اس جیسے ہی دوسرے بچوں کے سامنے ہوگی کہ معلوم کیا جائے کہ یہ لڑکی ریڈ انڈین امریکن ہے۔ آسٹریلین یا ریڈ انڈینز افریقین۔ ہے بھی کہ نہیں۔

بنگالی مالا سے لوگ کہانی سننے کی فرمائش کی گئی اور اس نے سادی۔ امرحہ کو اپنی فکر لگ گئی۔ یہ برطانوی لوگوں کو آخر کہانیوں کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بچے بھی اتنے شوق سے نہیں ہنستے جتنے شوق سے ان کے بڑے بوڑھے سنتے ہیں۔ لوگ کہانی تو امرحہ کو بالکل ہی نہیں آتی۔ کبھی اس کے گھر میں ایسی باتوں کا تردد ہی نہیں کیا گیا تھا۔ وہاں تو سب ادھر والوں کی باتیں، ادھر والوں کی باتیں، فلاں کی شادی فلاں کا رشتہ، فلاں کپڑے جوتے، یہ وہ۔ سب بے کار کی باتیں ہوتی تھیں۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ پنجاب کی لوگ کہانیاں ہیں، کون کون سی۔

تھوڑی سی دیر کو ایک طرف کو ہو کر اس نے دادا کو فون کیا۔

”تم پیرا، نبھانا دینا۔“ دادا نے مشورہ دیا۔

یہ تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے فلم دیکھی تھی، اسے کہانی یاد تھی، لیکن اس کی نوت ہی نہیں آتی۔ انیس لوگ کہانی سے زیادہ صوفی ازم میں دلچسپی تھی اور وہ امرحہ سے مختلف صوفی بزرگوں کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے ویسی کھانوں کے بارے میں معلومات لیں۔

”سننا ہے۔ ہندوستان میں زبردستی شادیاں کروادی جاتی ہیں۔“ مسز ایڈم نے پوچھا۔

”میں ہندوستانی کہیں پاکستانی ہوں۔“ امرحہ بڑی جزیب ہوئی۔

مسز ایڈم ہنسنے لگی ”تم سب پاکستانی انڈین ہندوستانی کہلائے جانے پر اتنا چڑتے کیوں ہو۔ ہندوستانی سے

ہیں۔“

”بیچے بڑے ہو جائیں، خاص کر ان کی شادی ہو جائے تو انہیں الگ زندگی شروع کرنی ہی ہوتی ہے۔ ہر ایک کو پرائیوسی چاہیے ہوتی ہے۔ یو نو پر سٹل اسمبلس۔“

سب اس کی باتوں کو بغور سمجھنے کی سستے رہے اور سر ہلاتے رہے۔
باری باری پھر سب کے خاندانوں کے بارے میں پوچھا گیا۔

”کیا بات کر رہی تھیں مسز گڈل۔“ امرج ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ ”پاکستانی مائیں کیا جانیں، پر سٹل اسمبلس یا پرائیوسی۔ انہیں تو اپنے لال اپنی آنکھوں کے آگے چاہئیں۔“

”یعنی تمہارے وہاں ابھی بھی خاندان بڑے ہی ہوتے ہیں۔ گڈل۔ کیا گھر بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں رہنے کے لیے؟“ امرج نے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا تو اس سے پوچھا گیا۔

”بس وہ انہیں اتنا پیار کرتی ہیں کہ ان کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتیں۔“
”اور بیٹے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟“ مشترکہ آؤ کے بعد پوچھا گیا۔

امرج گڑبڑا گئی، یعنی کچھ کہنے جتنے زیادہ بڑے تھے گھراتے ہی چھوٹے تھے۔ ان کے اس سوال کا مقصد طنز نہیں تھا۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا لوگوں کے پاس اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ بڑے کہنے بنا کر انہیں پال بھی لیتے ہیں۔ امرج کہاں سے چھوٹی اور کہاں سے بتائی، ان کے گھر صفائی کرنے والی آپا کے گیارہ بیچے تھے اور وہ ایک کمرے کے کرائے کے گھر میں رہتی تھیں۔

”بیٹے بھی وہی چاہتے ہیں جو ماں جی چاہتی ہیں۔“
AWW (آؤ) تینوں خواتین اپنی نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ پاکستانی مشترکہ خاندانی نظام سے متاثر نظر آ رہی تھیں۔ امرج انہیں وادادہ، نانا، نانی وغیرہ کے کرداروں کے بارے میں مزید بتانے لگی کہ کیسے وہ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں اور خاندان کو جوڑے رکھنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

وادا کے ایک دوست کے سات شادی شدہ بیٹے پانچ کمروں کے ایک گھر میں رہتے تھے۔
”سب مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔“ سو باتوں کی ایک بات امرج نے کر دی۔

”اسی لیے مشرقی لوگ جو مغرب کا سفر کرتے ہی تو اپنے گھروں کو یاد کر کے روتے ہیں۔“ مسز ایڈم نشو سے آنکھیں رگڑنے لگیں۔

”مگر کسی خاندان میں چار پانچ بیٹے ہوں تو۔۔۔ کیا وہ ایک ہی گھر میں ہمیشہ رہیں گے۔“
”گھر کی سربراہ ماں پانچوں بیٹوں کو ایک ہی گھر میں اپنے پاس رکھنا چاہیں گی۔“

امرج ترجمانی نظروں سے تینوں خواتین کو دیکھتی رہی۔ اس نے یہاں اپنی بہترین پرفارمنس دی تھی۔ ڈی این اے بچی خاموشی سے امرج کے پاس بیٹھی اسے ہمہ تن گوش سن رہی تھی۔ امرج کو صرف ایک اس بچی سے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے غلط ثابت نہ کر دے۔

”ایک ہی گھر میں۔۔۔ پانچوں کو ان کی بیویوں اور بچوں کو؟“
”جی سب کچھ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کسی وجہ سے کہیں الگ رہائش اختیار کرنا چاہے گا تو والدہ رو کر اپنا برا حال کر لیں گی۔“

”تم اپنے گھر کو یاد کر کے روتی ہو؟“ ڈی این اے نے پوچھا۔

”کیوں وہ رویں گی کیوں؟“ تینوں خواتین نے مشترکہ AWW (آؤ) کیا۔
”وہ کسی ایک کو بھی خود سے جدا نہیں کرنا چاہیں گی۔“

اب امرج اسے کیا بتائی کہ اسے تو اس خیال سے ہی رونا آجاتا تھا کہ اسے کبھی تو واپس گھر جانا ہی ہے۔
”نہیں۔ ابھی مجھ پر یہ نوبت نہیں آئی۔“

(Star-Flyer) جھولا تھا۔

”ماکستانیوں کی کوئی ایک بڑی خولی بتاؤ؟“

”وہ بدترین حالات میں بھی زندہ رہنا جانتے ہیں۔“

امردہ نے جھٹ کہا۔

”ماچھروالوں کی کوئی ایک بڑی خوبی ہتاؤ؟“ امرحہ نے لوجھا۔

”ہم بدترین حالات کو بردہ لے جاتے ہیں۔“ اس نے مضبوط قوت ارادی کے تاثر کے ساتھ کہا۔

امرحہ دنگ سے دیکھتو رہ گئی۔

ان سب کے ساتھ گروپ فوٹو لیں۔ مسٹر ایڈم نے ان کے لیے ایک چھوٹی سی تقریر کی، جس کے آخری جملے کو امرحہ نے ڈی این اے پیج کی طرح نوٹ کب میں نوٹ کر لیا۔

There are never any winners
or any loser participation is
Remember that and enjoy
the
challenge of each moments

as it arises now

امرحہ اپنے ساتھ اپنی غیر استعمال شدہ ایک گرم شال اور ایک کشمیری طرز کا شولڈر بیگ لے گئی تھی اور ایک چوڑیوں کا سیٹ تھا اس کے پاس۔ یہ تینوں چیزیں اس نے تینوں خواتین کو پیش کیں اور ان تینوں کے چہرے ایسے دکنے لگے جیسے انہیں پیش قیمت جواہر پیش کر رہے گئے ہوں۔ جاتے ہوئے ان سب کو بوم بیک پائی دی گئی۔ ڈی این اے بچی نے اسے اپنا ای میل ایڈریس دیا کہ امرحہ ہر صورت اسے اپنی رپورٹ بھیج دے۔

امرہ اسے ضرور بھیج دے گی، اگر وہ اپنا ڈی این اے کروانے میں کامیاب ہو گئی اور خوش قسمتی سے وہ رڈ انڈین بھی نکل آئی تو۔

مانچسٹر کا ڈلی گارڈن میں 230 فٹ اونچا اشار فلائر

(Star-Flyer) جھولا تھا۔

”اگرچہ دیکھو گی کہ دو سو تیس فٹ کی بلندی سے ماچسٹر کیا لگتا ہے؟“ یونی کے باغ میں گم صم بیٹھا دیکھ کر ویرانے قریب آکر اسے لانچ دی اور زبردستی اسے اسے ساتھ بٹھا کر کھڑی گاڑیوں لے آئی۔ کچھ وہ او اس تھکی کہ قریب سے گزرتے عالیاں سے اس نے ہائے کہا تو وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے وہ اس سے کوئی خیرات مانگ رہی ہو اور وہ اسے خیرات دیتے دیتے تھک گیا ہو۔ اور کچھ وہ اپنے ذہن کو کہیں اور لگانا چاہتی تھی، تاکہ کم سے کم سوچ سکے کہ وہ ماچسٹر کو 230 فٹ کی بلندی سے دیکھنے کے لیے جھولے میں بیٹھ گئی۔

لیکن دوسو تیس فٹ کی بلندی سے اسے مائیسٹرو
 کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے تو موت نظر
 آ رہی تھی۔ موت۔۔۔
 ویرانے اس کی کمر میں گھونسا جڑا۔ ”خاموش بیٹھو
 امر۔۔۔“

لیکن امرجہ نے دور سے بہت دور دھندلے ہوئے
ماچسٹر کو جیسے آخری بار دیکھا اور سارے ماچسٹر کو گواہ
بنایا کہ میں مرنے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ آؤ اور مجھے بچالو۔۔۔
ہائے مجھے بچالو۔۔۔۔۔“

وہ ایسے چلائی۔۔۔ ایسے چلائی اور چلاتی ہی رہی کہ
بست سے وقتی بسرے ہو گئے ہوں گے پونی کے کئی
اسٹوڈنٹس اشار فلاٹر میں موجود تھے۔ گول گول
گھومتے جھولے میں بیٹھے انہوں نے اپنے کانوں میں
انگلیاں ٹھونس لیں۔ ویرانے تختی سے اس کے منہ پر
ہاتھ رکھا۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے
بھلا۔ وہ مرنے جاری ہو اور چلائے جسے تاب۔ واوا۔ واوی
جی۔

وہ تو اس لیے بھی اشارہ فلان میں بیٹھ گئی تھی کہ روسی
کمانڈو ویرا کے آگے اس کی بجلی نہ ہو۔ پر بجلی بہتر
تھی۔ یہ نسبت موت کے ہے نا "تم اتنا ڈرتی ہو۔"
زمین پر آتے ہی ویرا نے اس کے پاؤں میں زوردار چٹکی
بھری آخر سر سن سی نہ ہو چکی ہوئی تو اس چٹکی پر چلا

اٹھتی۔ ”مجھے نہیں پتا تھا میں اتنا ذروں کی۔۔۔ ویسے ایسے کو شش کی۔۔۔“

اگلے دن شروع کے دو لیکچرز چھوڑ کر اسے ایک پاکستانی گھر جانا پڑا۔ سادھنا کی کمر میں بہت درد تھا اور

”مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اشارہ فلاں کا آخری رائڈ (Ride) تھا تم مجھے اس پر ہی حکومت اسے بیٹن کر دیتی۔“

شکر تھا وہاں کامل نہیں تھا۔۔۔ امرجہ آس پاس شرمندہ شرمندہ سی دیکھ رہی تھی۔ جو لوگ ان کے ساتھ چھوٹے میں بیٹھے تھے وہ بھی کڑے تیوروں سے دونوں کو گھور کر گزر رہے تھے یعنی ہمارا تو مڑا خراب

[illegible]

امجرات کو سوئی تو پھر سے دو سو تیس فٹ کی بلندی پر تھی۔ آنکھ کھلی تو سادھنا اور این اون اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔ ویرا نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی اُن کی۔

”کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے؟“ سادھنا اسے پانی پلانے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ آپ دونوں جائیں۔“
ابن اور اس کی بیٹیایاں مل رہی تھیں۔
ہوتے تھے، لیکن اس کی بر آ کر تو انہوں نے حد ہی نہ کر دی
تھی۔ اتنے زبردست کہ آنکھ جھپکے بنا دیتے جاؤ۔

”جب تم ٹھیک ہوتی ہو تو ایسے چلاتی ہو؟“ این
ادن نے اپنے دل پر کھ کر کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

”کوئی پریشان ہے تمہیں امجد؟“ سا دھننا اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”تم پہلے جیسی نہیں رہیں۔“
 دوستی جو ہوتے ہوئے رہ چکی ہوتی ہے وہ ایگزٹر میں
 دشمنی بھکا جاتی ہے۔

”تم جیسی کیسی؟“
 ”تم مجھ سے گئی ہو، ایسے لگتا ہے تمہارے اندر اسٹوڈنٹس کا تو قصور نہیں وہ تو کتابوں کو بھی ایسے ہی سر نہیں نہیں۔۔۔ اس میں بے چارے

کچھ سوکھتا جا رہا ہے۔
تھک جاتی ہوں میں۔

پر سوار کرتے ہیں جیسے فیس بک، ٹویٹر، یوٹیوب کو۔
انہیں انہیں بڑھنے کی بھی اتنی ہی بے قراری ہوتی ہے۔

”گناہ یہ نہیں ہے، اور تم بالکل ٹھیک
ہو۔“ سادھنا اس کے بال چھو کر چلی گئی۔

”کاش یہ خواب ہی ہو۔ اور کھڑکی کے پیچھے اچھے معاوضہ پر جاب آفر ہوئی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔“

دوسرے سمسٹر نے اس پر خوف طاری کر دیا تھا۔
دوسرا سمسٹر بھی ایک دن ختم ہو جائے گا، تیسرا اور چوتھا
بھی۔ بس پھر سب ختم۔ چلو گھر واپس۔ اسی
ماحول میں جس میں وہ محسوس بھی۔

وہ رات کو مانچسٹر میں سوئی۔ صبح آنکھ کھلتی تو لاہور
ماڈل ٹاؤن اپنے گھر میں ہوئی۔ دادا کے کمرے کی
کھڑکیوں سے روشنی لیکر بناتی عین اس کی آنکھوں پر
برس رہی ہوئی۔ تملکا کروہ آنکھ کھولتی سامنے ہی دادا
اور اس کی مشرکہ تصویر دیوار پر جگمگا رہی ہوئی۔ وہ
چچا کا کراٹھ جاتی۔

”میں لاہور کب آئی۔ مانچسٹر کہاں گیا؟“
اس کے دل کے دھڑکنے کی رفتار خطرناک حد تک
بڑھ جاتی، ششیل کاک کے نیم اندھیرے کمرے میں وہ
گہری گہری سانسیں لے رہی ہوئی، اٹھ کر کھڑکی تک
جاتی، باہر مانچسٹر پر نظر دوڑاتی۔ اسے پھر بھی لگتا یہ
خواب ہی ہے۔ حقیقت میں تو وہ ماڈل ٹاؤن اپنے گھر
کے بیڈ پر سوئی ہے خواب دیکھ رہی ہے۔
وہ دیرا کو فون کرتی۔ ”دیرا! صبح یونیورسٹی جانا
ہے۔“

”نہیں۔۔۔ صبح تھیں الیکٹرک چیر بر بٹھایا جانا
ہے۔ صبح تمہاری موت کا دن ہے۔“ دیرا چلا کر
نکلتی۔

وہ کئی بار اس بے چاری کو ایسے تنگ کر چکی تھی۔
”تمہیں یہ راتوں کو کیا دورے پڑتے ہیں
امرچ۔“ دیرا ج پوچھتی۔

اب وہ اسے اپنے دوروں کی کیفیت کیا سمجھاتی کہ
اس کی آنکھ جب لاہور میں کھلتی ہے تو اس پر کیا گزرتی
ہے۔

وہ سائی کے پاس اگلی صبح آئی۔
”سائی! میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہاری شادی
ہو رہی ہے۔“

”اچھا! وہ مسکرانے لگا، ”کیا مجھے اب یہ نہیں پوچھ
لیتا چاہیے کہ کس کے ساتھ؟“
”ہاں پوچھ لو۔“ لڑکی کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن اس

کر دیا۔ اس کا دل نہیں چاہا اپنا اسٹور چھوڑ کر جانے
کے لیے۔ وہاں سات سیزمین اور دو میجر تھے وہ ان
سب کی عادی ہو چکی تھی۔ بغیر کسی وجہ کے ان سے
وابستگی محسوس کرتی تھی۔

امرچ تبدیلی کو پسند بھی کرتی تھی اور تبدیلی سے
خائف بھی رہتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک
چیز کے لیے پوری شدت سے تبدیلی کی خواہش کی
تھی۔ اپنے ماحول کے بدل جانے کی۔ پاکستان میں
اس کے لیے بنائے گئے ماحول میں اس کا دم گھٹتا
تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔

اور اب یہاں۔۔۔ یہاں اسے ہر چیز کے ساتھ گہری
وابستگی محسوس ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کے ساتھ۔
اپنی کلاس۔ کلاس میں موجود اپنی نشست کے
ساتھ، کلاس ڈور تک کے ساتھ۔ پونی کے ایک، ایک
درخت، گھاس کے ایک ایک قطعے کے ساتھ۔ پونی
میں جا بجا ہستادہ خاموش مشہور شخصیات کے مجسموں
تک کے ساتھ بھی۔ ہر چیز اسے اپنا آپ محسوس
کراتی تھی۔ اس سے باتیں کرتی تھی۔ وہ جانتی
تھی وہ مانچسٹر میں مہمان ہے اور یہی چیز اسے کرب میں
بتلا کر دیتی تھی۔ آکسفورڈ روڈ پر واقع چرچ کی
پیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ کبھی کبھی دادا سے بات کر لیا کرتی
تھی ورنہ خاموش بیٹھی آتی جاتی ڈیل ڈیک بسوں کو ٹکا
کرتی تھی اور ہنسنے مسکراتے باتیں کرتے اسٹوڈنٹس کو
کسی قدر حسرت لیے دیکھا کرتی تھی۔ کبھی وہ بھی
ہنسنے والوں میں شامل رہی تھی۔ بے فکری تھی۔

چرچ کی پیڑھیوں پر اکیلے بیٹھنے کی نوبت وہ خود پر خود
لے آئی تھی۔ اور اکثر وہ وہاں پائی جاتی۔ اور سوچا
کرتی کہ اگر اسے پاکستان جانا ہے تو ان سب چیزوں کو
اٹھا کر اسے ساتھ لے جانا ہے۔ یہ سب جو اس کا اپنا
نہیں تھا لیکن جس نے اسے اپنا بنالیا تھا۔

یہ سب اپنا ہے۔ یہ سب اپنا نہیں رہے گا۔
یہ یہیں رہ جائے گا۔ اگر یہ سب یہیں رہ جائے گا تو وہ
تو خالی ہاتھ رہ جائے گی نا۔ تو کیا مانچسٹر اسے سب سے
کر سب واپس بھی لے لے گا۔

”ہاں!“ وہ شرارت سے مسکرانے لگا۔ مسخری
ہنسی۔

”تم ایسے کیوں ہنس رہے ہو؟“

”ایسے کیسے؟“

”مسخری سے۔“

”مجھے تو پتا بھی نہیں کہ میں مسخری ہنسی ہنس رہا
ہوں۔“

”ایک بار میری بہن بھی ایسے ہی ہنسی تھی میں نے
اس کے بال پکڑ لیے تھے۔ دوبارہ نہیں اس نے مجھے
چڑایا تھا۔“

”میں تمہیں چڑاؤ نہیں رہا۔ البتہ تم میرے بال پکڑ
سکتی ہو۔۔۔ ویسے بال پکڑ کر تم کیا کرتی ہو۔۔۔؟“

”میں نے اس کا سر دیوار میں دے مارا تھا۔۔۔“

غیر ارادی طور پر عالیان اس سے ایک قدم دور
ہوا۔ اپنا سر بچانے کے لیے۔۔۔ امجد نے فلک
شگاف قہقہہ لگایا۔

”مجھے یقین دلاؤ کہ تم مذاق ہی کر رہی ہو۔۔۔“ وہ
رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے ایسا کیا ہے۔۔۔“ امجد کو اس کی حیرت
اچھی لگی۔

”تم بہت چھوٹی ہو گی تب نا۔۔۔“ حیرت سے اس
کی آنکھیں امجد پر ٹھہری گئیں۔

”نہیں۔۔۔ میں فرسٹ ایر میں تھی تب۔۔۔“

”اور اس کا کیا بنا؟“ بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کو اس
نے بائیں آنکھ کے کنارے رکھا۔

”کس کامیری بہن کا؟“ امجد کو اس کی حیرت اچھی
لگی۔

”نہیں اس کے بے چارے سر کا۔۔۔؟“

”ٹھیک ہی رہا۔۔۔ بس اب وہ ذرا سی تیز آواز میں
بات کرے تو اس کے سر میں ٹیس اٹھتی ہے۔۔۔“

امجد نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔
”کیا اب بھی تم تیار ہو اپنے بال پکڑوانے کے
لیے۔“

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔“ وہ اپنے سر کو اس سے

نے چوبلی بہن رکھی تھی ہاتھوں میں گول گول ہندی لگا
رکھی تھی۔

بہنست ہماری رنگوں نے سائی کے وجود کا احاطہ کیا۔
”سنا ہے خواب الٹے ہوتے ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں
اس سے۔۔۔“

”یہ الٹ نہیں ہو گا۔۔۔ میرے دادا کہتے ہیں فجر کے
وقت دیکھ گئے خواب سچے ہوتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ بہنست ہماری رنگ پھر سے اس کے
وجود کے گرد اڑائیں بھرنے لگی۔

”مجھے حیرت ہے کہ تم نے میرے لیے خواب
دیکھا۔“

”مجھے حیرت نہیں ہے۔۔۔ ہم باقاعدہ دوست نہ
سہی ہم میں ایک تعلق تو ہے۔۔۔ تم نے کتنی بار سنا
ہے مجھے۔۔۔“

سائی کی آنکھیں غم ہو گئیں وہ Say it all
تھا۔ پوری پوری اس کے پاس آتی تھی۔ اور وہ۔۔۔

اس نے پاس کوئی نہیں ہو گا شاید۔

”میں جذباتی ہو رہا ہوں، مجھے تمہارا خواب اچھا
لگا۔“

”کیا تم مجھے اپنی شادی میں بلاؤ گے؟“

”کیا تم میری شادی میں آؤ گی۔۔۔ ہاں ضرور آنا۔۔۔“

عالیان کے ساتھ۔۔۔ اوہ۔۔۔ اس نے اپنی زبان
پکڑ لی۔ وہ واقعی جذباتی ہو رہا تھا اس کی زبان پھسل
گئی تھی۔ مطلب عالیان بھی اس کے پاس آیا

تھا۔ شاید آدھی رات کو آیا ہو۔۔۔ اسے جگا کر بورڈ کو
اس کے پاس ٹکا کر۔ یا اسے اپنے ساتھ چل قدمی پر
آمادہ کر کے۔۔۔

بہار سے پہلے اور بہار کے بعد نجانے وہ کتنی بار
آچکا ہو گا سائی کے پاس۔۔۔ امجد سے ملنے کے بعد اور

امجد کو چھوڑ دینے کے بعد۔۔۔

سائی کے سامنے قہقہے لگاتے ہوئے۔ سائی کے
سامنے آنسو چھپاتے ہوئے۔ ایک بار امجد نے

عالیان سے پوچھا تھا۔
”تم بھی سائی کے پاس گئے ہو؟“

اسے دیکھ کر مسکرانے پر مائل لوگ مسکراہٹ روک لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ امرجہ کو اس کی اس شبیہ نے سناکت و جلد سا کر دیا۔ کیا یہ عالیان تھا؟
”تم یہاں ایسے کیوں کھڑی ہو؟“ دیر اچھے سے آئی اس کے ہاتھ میں دو کافلی تک تھے۔

”میں۔۔۔ میں تمہیں ڈھونڈنے آئی تھی۔“

”کیا میں گم ہو چکی ہوں۔۔۔ کب؟“

”مجھے تمہارا فون چاہیے تھا، دادا سے بات کرنی ہے۔ میرے فون میں کچھ مسئلہ ہے، لاؤ اپنا فون دکھاؤ۔“ وہ دیرا تھی۔ دیرا۔۔۔ زیر۔۔۔ زیر۔۔۔ سیو نیٹی (0070)

”تم اپنا فون دے رہی ہو یا نہیں۔۔۔“ امرجہ نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

”اپنا فون دو، میں ٹھیک کر دیتی ہوں یا گل۔۔۔“

”وہ خراب تھا میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔۔۔“ امرجہ کی قسمت خراب کہ اسی وقت اس کے بیک کی اوپری جیب میں رکھے فون پر کسی کامیسیج آیا۔ کسی پاگل نے اسے اس وقت میسیج بھیجا تھا۔ یہ کوئی وقت تھا بھلا۔۔۔ ویرانے دائیں آنکھ کی کمان اچکاکی ”یعنی فون تو گھر ہے نا امرجہ۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟“

”اوہ یہ تو میرے پاس ہی ہے۔۔۔“ امرجہ کی اداکاری عروج پر تھی۔

”اور بھی دیکھ لو۔ کیا کیا تمہارے پاس ہی ہے جسے تم گمشدہ سمجھے بیٹھی ہو۔“

”یہ کافلی کس کے لیے ہے؟“

”میرے اور عالیان کے لیے۔“

نجانے کیوں لیکن اسے لگا کہ گرم کافلی ویرانے اس پر انڈیل دی ہے۔ وہ ہے کون عالیان کے لیے کافلی لے جانے والی۔ اور عالیان کیوں پیسے گا اس کی کافلی۔۔۔ جی نہیں۔ نہیں پیتا وہ ایسے ویسوں کی کافلی ٹویٹ۔ سوچ کا یہ ریلہ ایک دم سے اس کے ذہن میں آیا۔ وہ تیزی سے جانے لگی اور جاتے جاتے اپنے الیشین فلک کے نام سے مشہور ہو چکے دوپٹے کو تیزی سے سنبھالنے کی آسکر ایوارڈ اداکاری کرتے ویرا

اور دور لے گیا۔

”پھر بتاؤ تم نے سائی سے کیا کہا۔۔۔ میرے بارے میں بی کچھ کہا ہو گا۔۔۔“

”تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ تمہارے بارے میں بی کچھ کہا ہو گا۔۔۔“

”تمہارے ہنسنے کے انداز سے۔۔۔ کیا تم نے اسے یہ بتایا ہے کہ میں ابھی بھس کر کے روتی ہوں اور ایسا کرتے کس قدر بری لگتی ہوں۔۔۔ یا تم نے اسے یہ بتایا ہے کہ میں نے تمہیں پھنسا دیا تھا۔۔۔؟“

عالیان لب دبانے اپنی ہنسی دبانے کی کوششیں کرتا رہا اور جب مذاقاً ”صرف اسے ڈرانے کے لیے امرجہ نے ہاتھ اس کے بالوں کی طرف بڑھائے تو وہ تہقیر لگاتا ہوا بھاگ گیا۔

”میں اب اسے یہ بتانے جا رہا ہوں کہ وہ تم جیسی خوں خوار جنگلی بلی سے بچ کر رہے۔“ جاتے ہوئے وہ کہہ گیا۔

سائی دیکھ رہا تھا کہ امرجہ چپ کی چپ ہی رہ گئی ہے۔

”امرجہ۔۔۔ سائی نے اسے متوجہ کیا۔

خاموشی سے سائی کو دیکھ کر امرجہ اس کے پاس سے چلی آئی۔ اور برنس ڈیپارٹمنٹ آگئی۔

کاش آج تو اسے عالیان نظر آجائے۔ اور کوریڈور میں دیوار کے ساتھ سر نکائے، ایک سیدھی اور ایک ترپھی ٹانگ کھڑی کیے اپنے آئی فون کے ساتھ مصروف وہ اسے نظر آیا۔ امرجہ کو خود کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اتنے بڑے مانچسٹریں اکیلی رہ گئی ہے۔

جبکہ اسے دیکھ کر اس نے جانا کہ اکیلا ہونا کسے کہتے ہیں۔

وہ ایسے خاموش کھڑا تھا جیسے اس کی زبان نے کبھی کلام کی زحمت ہی نہیں اٹھائی، نہ وہ یہ خواہش رکھتی ہے۔ کوئی اتنا خاموش ہو سکتا ہے کہ اس پر یہ گمان

گزرے۔ عالیان پر یہ گمان پختہ ہو رہا تھا۔ جن بہاروں کو ساتھ لیے وہ چلا پھرا کرتا تھا، ان سب بہاروں کو خفا کے ان سے خفا ہوئے وہ بے نور سا کھڑا تھا۔

وہ ایسے خاموش کھڑا تھا جیسے اس کی زبان نے کبھی کلام کی زحمت ہی نہیں اٹھائی، نہ وہ یہ خواہش رکھتی ہے۔ کوئی اتنا خاموش ہو سکتا ہے کہ اس پر یہ گمان

گزرے۔ عالیان پر یہ گمان پختہ ہو رہا تھا۔ جن بہاروں کو ساتھ لیے وہ چلا پھرا کرتا تھا، ان سب بہاروں کو خفا کے ان سے خفا ہوئے وہ بے نور سا کھڑا تھا۔

وہ ایسے خاموش کھڑا تھا جیسے اس کی زبان نے کبھی کلام کی زحمت ہی نہیں اٹھائی، نہ وہ یہ خواہش رکھتی ہے۔ کوئی اتنا خاموش ہو سکتا ہے کہ اس پر یہ گمان

گزرے۔ عالیان پر یہ گمان پختہ ہو رہا تھا۔ جن بہاروں کو ساتھ لیے وہ چلا پھرا کرتا تھا، ان سب بہاروں کو خفا کے ان سے خفا ہوئے وہ بے نور سا کھڑا تھا۔

کی کافی گرا بیٹھی۔

”اُدھ سوری۔“ کرمی ایوارڈ اداکاری۔

ویرا کی دائیں آنکھ کی کمان پھر سے اچکی
”مرجہ۔“

ویرا نے اتنا ہی کہا تھا کہ امرجہ جلدی سے واپس
پلٹ آئی۔ عالیان اس سے ناراض ہے۔ ٹھیک
ہے ایسا ہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ
کے۔۔۔۔۔

خیالات کا جھوم اس کے دماغ میں جھکنڈی طرح چلنے
لگا۔ وہ عالیان کو دیکھنے کیوں گئی تھی۔ کیوں۔۔۔؟ یہ
سوال اس کے اندر باز گشت بن گیا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا یا بس سب ختم ہو جائے
گا۔۔۔؟ امرجہ بلاوجہ یونیورسٹی میں چکر لگانے لگی۔
اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ سو جھوٹ بچ بول کر
اس نے اپنے آپ کو تسلی دے لی تھی۔ تو وہ تسلی
قائم کیوں نہیں رہ رہی تھی۔ وہ پاگل بنی بلاوجہ یہاں
سے وہاں گھوم رہی ہے۔

”یہ کیا تم تسلی بنی چکرار ہی ہو۔۔۔؟“ کسی نے کبھی
اس کے پیچھے آکر کہا تھا۔

”میں یونی گھوم رہی ہوں۔۔۔“
”میں تھیں روز ہی یونی گھومتے دیکھتا ہوں۔ کتنا
گھومنا ہے تم نے۔۔۔؟“

”مجھے ایسا کرنا پسند ہے۔ لیکن ٹھہرو۔ تم روز
میرا پیچھا کرتے ہو؟“

ایک دم اس کے چہرے کے رنگ بدلے جیسے اس
کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”ایسی باتیں معلوم ہو ہی جاتی ہیں۔۔۔“

”تم میری جاسوسی کرتے ہو نا۔۔۔؟“

”اے جاسوسی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔“ بیک میں
سے اس نے دو لولی پاپ نکالے ایک خود کھانے لگا ایک
اس کے آگے کیا۔

”کیا تم دائم کے لیے کام کر رہے ہو۔۔۔ اے یہ
خوف رہتا ہے کہ یونیورسٹی میں، میں ضرور کچھ الٹا
سیدھا کر کے پاکستان کا نام لے دوں گی۔ اے

میری سمجھ داری پر شک کیوں ہے آخر۔۔۔؟“

لولی پاپ منہ میں دبائے وہ جی جان لگا رہا تھا۔ ”تم
باتوں کو سننے سے رخ دے ڈالتی ہو امرجہ۔! تم ایسی باتیں
کرنا کہاں سے سیکھتی ہو۔۔۔ نہ میں تمہاری جاسوسی
کر رہا ہوں۔ نہ ہی دائم نے مجھے تمہارے پیچھے لگایا
ہے۔ ویسے پاکستان میں تم کافی مقبول رہی ہو گی۔“
امرجہ سننے میں آگئی۔ اسے کیسے معلوم
ہی۔۔۔ ”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے آخر۔۔۔؟“
اس کا رنگ فق ہو گیا۔

لولی پاپ منہ سے نکل کر وہ بلند بانگ قہقہے لگانے
لگا۔ ”تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ میری بات کو پھر
سے تم نے اپنی مرضی کا رنگ دے ڈالا ہے۔ تم باتوں
کو اپنی مرضی کے رنگ دیتی ہو۔ اور ایسے غصہ کرتی
ہو۔ بھڑکتی ہو۔ اور چڑ جاتی ہو۔ کتنا زرخیز دماغ
ہے تمہارا امرجہ۔ میں نے آج تک اتنا زرخیز دماغ
کسی کا نہیں دیکھا۔ امرجہ نت نئی سوچوں کی عظیم
کاشت کار۔ بابا۔۔۔“

”یہ پکڑو اپنا لولی پاپ۔ میں نہیں کھاتی یہ۔ بچی
نہیں ہوں میں۔۔۔“ وہ برامان گئی اور آگے بڑھ گئی اور
وہ لولی پاپ ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے ہولیا۔ اور
تب تک اس کے پیچھے ہی رہا جب تک اس نے وہ لولی
پاپ کھا نہیں لیا۔

خود سے اور سوچوں سے تھک کر امرجہ نے خود کو
تھکا ڈالا۔ ایسی تھکن جو کسی آرام اور دوا سے جانے
والی نہ تھی۔



”دھکیل تمناشا“ کتاب دس بارے زیادہ لیڈی مرکو
سنائی جا چکی تھی۔ ماشریالی اور رجنی نے ششل کاک میں
دیر تک راج کیا تھا۔ لیڈی مرکو کا دل ہی نہیں پھر تھا
اس کتاب کو سن سن کر۔۔۔ اور امرجہ کو ایسے یاد ہو گئی
تھی کہ وہ آرام سے شروع سے آخر تک تقریر کی طرح
اسے سناسکتی تھی۔ دسویں بار تو امرجہ نے کتاب
پکڑنے کی زحمت ہی کی تھی ورنہ کتاب تو اسے ازبر

ہو چکی تھی۔
پھر امرجہ انہیں ایک محبت سو افسانے سنانے لگی۔۔۔ نہیں نہیں اشفاق احمد کے لکھے نہیں یونیورسٹی میں لکھے جانے والے چلتے پھرتے افسانے ”سائی کی طرف سے تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا لیکن دینا گجرات سے ہے۔ اور سنا ہے اس کے خاندان والے خاصے روایتی ہیں۔ انہیں اگر معلوم ہو جائے کہ دینا ایک سیاہ فام عیسائی کو پسند کرنے لگی ہے تو مشکل سے ہی اسے ایک بھی دن یونی میں رہنے دیں۔۔۔“

ایڈی مہر سہلاقی رہیں انہیں سائی کی کہانی نے جذباتی کر دیا تھا۔
”مجھے تو عالیان کی فکر ہونے لگی ہے تمہاری کہانیاں سن کر۔۔۔“

امرجہ نے ایڈی مہر کو دیکھ کر نظریں چرائیں۔
”شارلٹ بھی آنے والی ہے فون آیا تھا اس کا۔۔۔“
عالیان بھی شاید کسی نمونے کو پسند کر چکا ہو گا۔۔۔ وہ خاموش ہی ہو گئیں۔

”عالیان کتنا بھی انکار کرے میں جلد ہی اس کی شادی کر دوں گی۔۔۔ وہ کتنا ہے کامیاب بزنس مین بن جاؤں گا تو سوچوں گا۔۔۔ لیکن تب تک شاید میں دیکھ نہ سکوں۔۔۔ مجھے انکار تو نہیں کرے گا لیکن میں زبردستی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔“

”آپ اس سے بہت پیار کرتی ہیں نا؟“

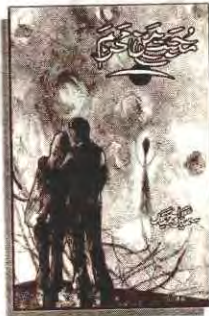
”نہیں۔۔۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔۔۔ اس کی محبت مجھے حیران کر دیتی ہے۔۔۔ میں نے ایک سال پہلے اسے منع کیا تھا کہ مجھ سے پوچھے بغیر وہ گھر نہ آیا کرے۔۔۔ دیکھ لو، میری سالگرہ کے علاوہ وہ کبھی مجھ سے پوچھے بغیر گھر نہیں آتا۔۔۔ وہ کچھ نہ کہے مجھ سے، میرے لیے کچھ خاص نہ کرے۔۔۔ مجھے خبر ہو جاتی ہے کہ میرے دس بچوں میں سے سب سے زیادہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ دوسرے بچے احسان مند ہو کر عقیدت میں مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن پہلی بار جب میں نے اسے گود میں بٹھایا اور اس کی روتی ہوئی

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور نمونہ

محبت میں محرم

سمیرا حمید



قیمت - / 300 روپے

مکھوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

نے کبھی ان کی مذہبی تعلیم میں اپنی خود غرضی کو آڑے آنے نہیں دیا۔۔۔ میں چاہتی تو سب بچوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے کہہ سکتی تھی، وہ مجھ سے اتنے متاثر تھے کہ فوراً ”میری بات مان لیتے وہ مجھے خدا کے بعد کا درجہ دیتے تھے۔ لیکن میں اپنی ذات میں چھوٹی ہو جاتی۔ میرے دو بیٹے اسلام کی اسٹڈی کر رہے ہیں اللہ کو منظور ہوا تو وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ شارلٹ۔۔۔ مورگن کبھی غیر مناسب لباس نہیں پہنتیں۔۔۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔۔۔ میری روایات میں سے انہوں نے کچھ کو اپنا لیا ہے۔ وہ مجھے وضو کرواتے رہے ہیں۔۔۔ میں قرآن پڑھا کرتی تھی تو میرے پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اذان پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ انہیں یاد ہوتا ہے رمضان کب آئے گا۔ عید کب ہوگی۔ جو احادیث فرمان میں نے انہیں سنائے ہیں وہ انہیں یاد ہیں۔۔۔ دیکھو امرجہ! ہم سچی محبت سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ سب۔۔۔ لیکن خود غرضی تنگ دلی، تعصب کو دل سے ختم کرنا ہوتا ہے۔۔۔ دل کو صاف کرو۔ پاک کرو تو ہی محبت مقدس ہو کر اڑتی ہے جسے مقدس

ہستیوں پر خدائی پیغامات نازل ہوتے ہیں۔۔۔ محبت بھی خدائی پیغام ہی تو ہے۔۔۔ محبت حساب کتاب سے بری ہوتی ہے۔۔۔ دل میں بال برابر بھی فرق ہو تو ”محبت“ اپنا رخ بدل لیتی ہے۔۔۔ منہ پھیر لیتی ہے۔۔۔ اس کے ”ابدی“ قیام کے لیے وجود کو پایا نہ رکھنا پڑتا ہے۔

امرجہ خاموش تھی اسے خاموش ہی رہنا تھا۔ چند دنوں بعد اس نے ایک سوئڈ بوئڈ آدمی کو تیز آواز میں نشست گاہ میں بحث کرتے سنا۔۔۔ نشست گاہ کا دروازہ بند تھا پھر بھی اس آدمی کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

”کون ہے یہ۔۔۔؟“ امرجہ نے سادھنا سے پوچھا۔
”معلوم نہیں۔۔۔ سال ڈیڑھ سال پہلے بھی یہ یہاں آیا تھا۔ کافی بحث کر کے گیا تھا۔ پولیس بلوائی بڑی

نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس بارے میں کبھی بات نہ کروں۔۔۔ وہ تکلیف سے گزرتا نہیں چاہتا، اتنے سے ذکر پر ہی وہ کئی دن گم صم رہا تھا۔ ایک دن وہ ٹھیک ہو جانے لگا میں جانتی ہوں۔۔۔ ہر دکھ اور صدمے کے بھرنے کا اپنا ایک الگ وقت اور انداز ہوتا ہے۔۔۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خوش باش ہے، بہت مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا تھا۔۔۔ جب تک وہ اور ٹھیک نہ ہو جائے میں کسی کو اسے تکلیف دینے نہیں دوں گی۔۔۔ وہ کوئی بھی ہو۔۔۔ خاندان کے نام پر اس کے پاس ایک ماں بھی جو جوانی میں ہی مر گئی۔ اب میں ہوں اس کا خاندان۔۔۔ اسی لیے مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ کسی ایسیائی لڑکی کو پسند نہ کر لے۔ ذات پات خاندان یہ سب ایسیائی لوگوں کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک سال پہلے یونیورسٹی میں عالیان کا ایک دوست بنا تھا پاکستان سے تھا۔۔۔ اچھا دوست تھا اس کا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ عالیان کی ماں ایک عیسائی عورت تھی تو اس نے آہستہ آہستہ عالیان سے تعلق ہی ختم کر لیا۔ کمال وہ عالیان کو اپنی زمینوں اور باغوں کی سیر کے لیے بلارہا تھا۔ عالیان بہت آبدیدہ ہوا تھا اس لڑکے کے سلوک سے۔۔۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ بچوں کی پوجا کرتے تھے جو مشرک تھے اور پھر وہ مسلمان ہو گئے لیکن ان میں سے بہت سوں کے گھر والے مسلمان نہیں ہوئے تھے تو کیا جو مسلمان ہو چکے تھے وہ اس لیے قابل نفرت رہے ہوں گے کہ ان کے خاندان کے لوگ ابھی بھی مشرک ہیں۔

جب عالیان چھوٹا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ اس کے کاغذات میں دو مذہب لکھے گئے ہیں۔ اسلام، عیسائیت۔۔۔ اسے دونوں مذاہب کی تعلیم دی گئی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ بالغ ہونے تک کوئی ایسا کام نہ کرے جو اسلام کے منافی ہو اور اس نے میری درخواست مانی۔

میں نے عیسائی بننے بھی پالے ہیں امرجہ! لیکن میں

وہ آنکھیں جو اسے دیکھ کر جگمگایا کرتی تھیں اب اسے پہچانے سے بھی انکاری ہو جاتیں تو وہ روسی پڑتی۔۔۔ اور پھر ایک بار وہ اسے مخاطب کرنے کی جرات کر بیٹھی۔

”عالیان!“ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بات کر رہا تھا، دوست چلا گیا تو وہ اس کی طرف پلٹا۔ اتنی دیر لگی اسے ملتنے میں۔

اس سے اگلی بات نہ ہو سکی اور گھر اگر اس نے بیگ میں سے ایک عدد چاکلیٹ اس کے آگے کی۔

”یہ لومیری طرف سے ٹوئیٹ۔۔۔“
ایک لمحے کے لیے سی سی لیکن وہ حیران ہوا۔
”میں تمہارے لیے لانی ہوں۔۔۔“ امرجہ نے مسکراتے کی کوشش کی جبکہ وہ رو دینے کو تھی۔

”میں ٹوئیٹ نہیں لیتا۔“ اس نے ایسا رخ موڑ لیا۔
”تو مجھے دے دے۔۔۔ میں ابھی بھی لیتی ہوں۔۔۔“
اس کی پشت سے وہ بولی۔۔۔ آواز کانپ رہی تھی اور وہ خود بھی۔۔۔

عالیان نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ لاجواب ہو چکا تھا۔ صرف ایک لحظے کے لیے وہ پرانا عالیان نظر آیا اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے کسی بھولے بھٹکے انسان نے اسے راستہ پوچھنے کے لیے روکا تھا۔

کتنا کچھ بدل گیا ہے۔۔۔ کتنا کچھ بدل رہا ہے۔۔۔
امرجہ نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔۔۔ اور جب وہ نظر آتا بند ہو گیا تو پلٹ گئی۔ جس وقت وہ پلٹی اس وقت عالیان نے اسے بہت دور سے خود کو مکمل چھپا کر جاتے دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تھی بعد میں یہ گھر کے اطراف میں گھومتا پھرتا بھی دیکھا گیا تھا۔

امرجہ نے رات کو لیڈی مرسے پوچھا تو انہوں نے سختی کا ایسا تاثر دیا کہ امرجہ معذرت کر کے اٹھ آئی۔
”یعنی دور رہو اس معاملے سے۔۔۔ اور امرجہ دور ہو گئی۔۔۔“

رات کو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی بڑھ رہی تھی کہ اس نے عالیان کو دیکھا۔
اور یہ پہلی بار تھا کہ اسے دیکھ کر اسے بہت برا لگا۔
اس کی سائیکل کے پیچھے دیرا بیٹھی تھی۔
شیش کاک کے باہر اسے اتار کر وہ چلا گیا اور ویرا ذرا سی لنگڑاتی ہوئی اندر آئی۔

”کیا ہوا تمہارے پاؤں کو؟“ امرجہ نے بڑی تنقیدی نظروں سے اس کے پیر کو دیکھا۔ اسے اس کے پیر کی قطعاً کوئی فکر نہیں تھی۔
”سڑک پر گر گئی تھی۔ ہلکی سی چوٹ آگئی ہے۔۔۔“

”تمہاری سائیکل کہاں ہے؟“
”آج تو میں سائیکل پر گئی ہی نہیں۔۔۔“
”تو تم واپس کیسے آئی ہو؟“

وہ رات بڑے آرام سے اسے دیکھا ”امرجہ! تم نے کھڑکی سے دیکھ تو لیا ہے کہ مجھے عالیان چھوڑ کر گیا ہے۔۔۔“

امرجہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔ یعنی اس کا پاؤں ٹوٹا تو اس نے عالیان سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔۔۔ رات کے اس وقت۔۔۔ اور وہ بھی آگیا۔۔۔“

رات گہری سیاہ ہو گئی۔ اور نیند سے اڑان بھری۔ ساری رات آسمان سے سیلابی برستی رہی۔
سب کچھ اس سیلابی کے لہاوے میں مدفون ہو گیا۔
اس کے لیے اگلی کئی راتیں سونا دو بھر ہو گیا۔

اس نے پھر سے ہمت کی عالیان کے پاس جانے کی۔ دوبارہ کئی اور اس کی پشت دیکھ کر ستم کر پلٹ آئی۔

سمیرا احمد

سکندر

امجد کی بدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں دادی اور ختیوں بہن بھائی دانیہ حماد اور علی اسے اکثر جہنم جلی، منحوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام تھے سن کر امجد خود ترسی کا شکار ہو کر رو رہی تھی۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امجد کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امجد کی اپنے دادا سے خوب ہمتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لا بھیری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لا بھیری میں تھے دادا سے سمجھاتے ہیں کہ تم بڑھائی پر دھیان دو اور اسکا لرشپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امجد اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح بڑھائی میں کمزور ہے مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے مگر ہندو روز قبل دولا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر فہم لگ جاتا ہے۔ امجد دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امجد کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کانچ و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکا لرشپ فارم بھرتی ہے مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالا خرما پچیس یونیورسٹی سے اسے اسکا لرشپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلباء سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امجد کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دولا کی میزبانی کے

مکمل ناول



بعد امرہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خورد و بست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دانتھتا ہے۔ اور جی امرہ کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا، شرٹی بیٹی لو اور ملی گول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے سشل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکو منڈر فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرہ کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس بیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں انیک ہو جاتا ہے۔ امرہ انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکو منڈی فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپانڈرین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرہ کی چیخ نکلتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے یہ اس کا گھر ہے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں ایک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگنا چاہتا تھا؟ دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دی ہے اس کی تربیت کی ہے۔ امرہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرہ کو احساس دلایا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا، وہ لا شعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

ہارٹ راک میں امرہ اور ویرا کی باتیں ریکارڈ کر کے چلانے پر امرہ ویرا سے ناراض ہو جاتی ہے۔ امرہ کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عالیان کے بارے میں یہ سب کہہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ہارٹ راک کیفے کے باہر امرہ عالیان کا انتظار کرتی ہے مگر وہ اس سے صبح سے بات نہیں کرتا۔ رات کو عالیان ویرا کو سشل کاک چھوڑ کر جاتا ہے امرہ کو یہ بات پری لگتی ہے کہ عالیان اپنی سائیکل پر ویرا کو چھوڑنے آیا۔ ویرا امرہ کو بتاتی ہے کہ وہ گر گئی تھی۔ اس کے پیر پر چوٹ آئی تھی اس لیے عالیان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

امرہ ہمت کر کے عالیان سے ملنے دوبارہ جاتی ہے۔ وہ اسے ٹویٹ میں چاکلیٹ دیتی ہے۔ عالیان حیران ہوتا ہے مگر پھر اس کی ٹویٹ لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس پر امرہ کہتی ہے کہ اگر تم ٹویٹ دو تو میں ابھی بھی تیار ہے۔ عالیان لا جواب ہو جاتا ہے۔

پانچویں قسط

اسے اس کے پیچھے جانے کی کوئی حاجت نہیں اسے خود کو اس سے دور ہی رکھنا تھا وہ خود کو دور ہی لے رہی تھی نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس آیا کرے۔ گیا تھا لیکن۔

آن براجمان ہوا اور وہ اس کیفیت میں آگیا جس میں بل سے چھلانگ لگا دی جاتی ہے، پٹپٹی پر پستول رکھ لی جاتی ہے اور ٹریگر دبانے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ یا سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر درود پوار سے فکریں ماری جاتی ہیں۔ اور دل کے مقام پر ٹکے مارے جاتے ہیں۔ یہ نقطہ فنا ہوتا ہے۔ بس مٹ جانے کی خواہش اس کا آغاز ہوتا ہے۔

اس نے بل سے چھلانگ لگائی نہ ٹریگر داسکا بس آب فٹا پیے دیوانوں کی طرح شہید لے، معلق گھومتے، چلتے، عالیان مارگریٹ کو فنا کر رہا۔

وہ قبرستان مارگریٹ کے پاس بھی گیا تھا، وہ وہاں مارگریٹ کے مرنے کے بعد پہلی بار خود چل کر گیا تھا۔ کڈ سینٹر میں قبرستان جانے کا انتظام کیا جاتا تھا، لیکن وہ سختی سے انکار کر دیا کرتا تھا اسے اس مارگریٹ کے پاس نہیں جانا تھا جواب تابوت میں بھی کیا تھا اگر وہ اس ایک کمرے کے گھر کے تابوت میں خود کو زندہ مردہ رکھنے پر قدرت رکھ لیتی۔ اب وہ اس کے پاس آیا تھا تو اس کے ہاتھ میں پھول نہیں تھے لیکن آنکھوں میں آنسو بہت تھے۔

مارگریٹ کی قبر کو ہتھیلی سے مسلتے اس کے اپنے اندر سے کچے گوشت کے دھیمی آج پر جلنے کی بساند آنے لگی۔ اس نے خود کو سونگھا۔ پاگلوں کی طرح سونگھا۔ وہ تو مارگریٹ بن رہا تھا۔ اسے خوف آیا۔ خوف سے وہ وہاں سے بھاگا۔

اسے مارگریٹ تو نہیں بننا تھا جبکہ وہ مارگریٹ ہی بن رہا تھا یعنی وہ مارگریٹ سے ملنے نہیں اس کے تابوت میں جگہ لینے گیا تھا۔

وہ ماچسٹر سے دور ہو گیا۔ اس نے زمین کی حدوں سے نکل جانا چاہا۔ وہ بے سمت سفر کرتا رہا۔ وہ ایک ہی ٹرین میں ایک ہی نشست پر دن بھر رات بھر بیٹھا رہتا۔ وہ کسی بھی ایک شہر کی ایک ہی سڑک پر

کروڑوں بار چکراتا رہتا۔ چالی کے گڈے کی طرح۔ چلتا تو چلتا ہی رہتا رہتا رہتا۔

رات بھر جاگنے کے بعد وہ منہ اندھیرے ہال سے نکل گیا تھا۔ ٹھنک کا یہ عالم تھا کہ اسے لگتا تھا زمین و آسمان آپس میں مل رہے ہیں اور وہ ان دونوں کے درمیان دب کر مر جائے گا۔ پہلے وہ ہال کے باغ میں آیا اس نے اپنا سانس بحال کرنا چاہا، لیکن ایسا نہ کر سکا اور اسے تیز تیز سڑک پر بھاگنا پڑا۔ ہر چیز اسے خوف زدہ کر رہی تھی اس کا دم گھوٹ رہی تھی۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور شہر کے اندر ہو کر بھی شہر سے دور نکل گیا۔ اگر وہ کسی سے بھاگ رہا تھا تو وہ کسی اس کے اندر تھا اور اس کسی کو وہ اپنے ساتھ لیے بھاگ رہا تھا۔ وہ کسی ایک مارگریٹ تھی ایک ولید البشر۔ ایک سسکیاں بھرتا ہوا ایک دھتکارنا ہوا، دو لوگوں سے سجامیدان حشر تھا اور ہر طرف خون ہی خون تھا۔ مارگریٹ کی مصومیت کا۔ شدت کا۔ عقیدت کا محبت کا۔

آخری چیز کوڑیوں کے مقابل دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تھی اور بے وزن رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنی ذات سمیت دنیا کے کسی عجوبے سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اسے کسی عروج، کسی کامیابی، کسی زندگی کی چاہ نہ رہی اپنی ذات کی حکمرانی میں اس نے ایک غلام کی حیثیت اختیار کر لی۔ نئے جہانوں کی دریافت کے خواب پست ہوئے۔ یہ خیال ہی اسے دیوانگی لگا کہ اب وہ پہلے کی طرح ٹھیک ٹھیک زندہ رہ سکے گا۔ اس پر ہر خیال گراں گزرا سوائے موت کے خیال سے۔ اس پر وارو ہونے والی چیزوں میں آگے بھی موت رہی اور پیچھے بھی۔ اول بھی آخر بھی۔ ضروری بھی اور اشد بھی۔

وہی سب اس کے ساتھ ہونے لگا جو مارگریٹ کے ساتھ ہوا تھا، اپنے بیٹے سے بے تحاشا محبت کے باوجود وہ اس کے لیے زندہ نہ رہ سکی اور ولید البشر سے نفرت کے باوجود وہ اس کے لیے مر گئی۔

اس میں قصور مارگریٹ کا نہیں تھا۔ اس میں قصور اس دور فنا کا تھا جو محبت کی مٹھی میں بند ملتا ہے۔ ایک ہی رات میں یہ دور فنا اس کے وجود کی پیٹی میں

فراموش کر دیتا، بیٹھتا تو صدیاں گزار دیتا۔ وہ فصلے کی کیفیت میں تھا نتیجے کی۔ وہ آرتھنا پار۔ بس وہ کم ہو چکا اور خود کو ڈھونڈنے کی رتی برابر کو خوش نہ کرتا ہوا عالیان تھا۔ جیسے اس پر سب آشکار ہو چکا تھا اور وہ سب سے انجان بھی تھا۔

”دیکھو میں کو درجاؤں کی ولید۔ ہاں میں کو دربی جاؤں گی۔ آکر مجھے روک لو۔ لو میں کو دربی ہوں۔“

آخری سفر سے پہلے آخری جملوں میں سے ایک یہ جملہ بھی تھا۔ وہ سہم کر مار گریٹ سے لپٹ جا آ کہ وہ اٹھ کر بھاگ نہ جائے اور کو در نہ جائے۔

اور وہ زندگی کے اس طرف کو دربی گئی۔ اور زندگی کے اس طرف اس کا بیٹا بیٹھا تھا۔ لندن

بنج۔

مار گریٹ کو لندن برج پسند تھا ان دونوں کی آخری تصویر وہیں لی گئی تھی۔ کو در جانے کا خیال اس کے ذہن میں بھاگ دوڑ رہا تھا۔ وہ ایک بیچ رہ بیٹھا تھا۔

”تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“

ایک افریقی عورت کی مشقت زدہ اور تھکی ہوئی آواز آئی وہ ایک آٹھ سالہ بچے کو اس کے پاس بٹھا کر خود چلی گئی بچہ لاغر اور بیمار سا تھا ماں کو دور جاتے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے قریب رکھے تھیلے کو کھولا اور اس میں سے کسی قدر عقیدت سے تین گھوڑوں کا گول گول گھومنے والا کھلونا نکالا۔

کھلونا کافی خستہ حال اور ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ بچے نے انگلی کو ایک گھوڑے کی انگلی ٹانگوں میں پھنسا کر اسے گول گھما دیا۔ تینوں گھوڑے آگے پیچھے بھاگنے لگے اور گھوڑوں کے ٹاپوں اور ہنسنے کی آوازیں کھلونے میں سے نکلنے لگیں۔

بچہ ایسے مسکراتے لگا جیسے کسی ایک گھوڑے پر وہ خود سوار ہو۔ سب سے آگے والے پر۔ گھوڑوں

کے ساتھ اس کی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ بچے کے

نہنے سے قہقہے نے عالیان کو متوجہ کیا پھر اس کی جاندار مسکراہٹ نے۔ بچہ ساری دنیا سے بے نیاز گھوڑوں کو دوڑا رہا تھا۔

”تم انہیں دوڑانا چاہتے ہو؟“ بچے نے اجنبی کی نظرس خود پر محسوس کر کے اسے اپنا خزانہ استعمال کر لینے کی اجازت دینی چاہی۔

”یہ دیکھو یہ ایسے چلتا ہے۔“ اس نے گھوڑے کی انگلی ٹانگوں کو پکڑ کر گھمایا۔

”اور سنو ان کی آوازیں کتنی پیاری ہیں۔ میں نے کبھی اتنی پیاری آوازیں نہیں سنی ہیں تم نے بھی نہیں سنی ہوں گی۔“ کھلونا اس نے عالیان کے کان کے قریب کیا اور یہ سب کرتے وہ ایسے پر جوش سا تھا کہ ایک اجنبی اس کے کھلونے سے متاثر ہو چکا ہے۔

عالیان نے بچے کو ایسے دیکھا کہ وہ ان دونوں ہر چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ یہ سب کیوں زندہ ہیں۔ کیا انہیں نہیں مرنا۔

اسی پل اس کے اندر کسی قوت نے اسے اکسایا کہ وہ بچے سے مکالمہ کرے اور پھر اس مکالمے پر وہ خود کو آریا بار کرے۔ یہ قوت اتنی شدت سے اس کے اندر جاگی کہ اتنے دنوں سے ایک لفظ بھی منہ سے نکلنے کی زحمت نہ کرتے عالیان نے خود کو بوتلے پایا۔ اس نے بچے کے ہاتھ سے کھلونا لے لیا۔

”یہ تو ٹوٹا ہوا ہے۔“ اس نے قدرے سفاکی سے کہا۔

بچے کا بیمار چہرہ پھیکا سا رہا اور اسے اپنی پیاری چیز کے لیے اپنے کلمات پر صدمہ پہنچا۔

”نہیں! یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے اس انداز میں کہا کہ دنیا کا کوئی انسان اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

”دیکھو اس گھوڑے کی دم نہیں ہے۔ اس والے کا سر نہیں ہے۔ اور اس گھڑسوار کا بازو ٹوٹا ہوا ہے۔“

اس بات سے اسے اور صدمہ ملا لیکن اس نے ایسا انداز اپنا لیا کہ وہ اس بات کے خلاف بھی ڈٹ کر دکھا

سکتا ہے۔

”اس سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ گھوڑے پھر بھی دوڑتے ہیں۔“ اس نے اس انداز میں ہنس کر کہا جیسے عالیان پاگل ہو۔

عالیان پاگل ہی تھا۔ وہ بچے کی بات پر سن ہو گیا۔

”اس سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ گھوڑے پھر بھی دوڑتے ہیں۔“ یہ گویا اس کے کانوں کے پردوں سے کہیں اندر آگئی۔ بہت دور تک۔

بچے نے جو فلسفہ اپنا رکھا تھا۔ وہ فلسفیوں کے بس کی بات نہ تھی۔

”اگر ان سب گھوڑوں کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔ سر بھی۔ اور سب گھڑسوار مرجائیں تو؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”یہ پھر بھی دوڑیں گے میں انہیں دوڑالوں گا اور گھڑسواروں کو میں مرنے نہیں دوں گا۔“ بچے نے انقلاب برپا کر دینے والے انقلابی کے سے انداز میں بات کی منہ کی منہ میں لہرا کر کہا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے ایک گھڑسوار پر انگلی رکھی۔

”یہ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ تمہاری زبان میں یہ مرجکا تھا۔ میں نے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر باندھ دیا۔ تم غور کرو گے تو بھی تمہیں وہ باریک مضبوط دھاگہ دکھائی نہیں دے گا جس سے میں نے اس گھڑسوار کو باندھا ہے۔ کرو غور ڈھونڈو وہ دھاگہ۔“

عالیان نے غور کیا وہ دھاگے کو ڈھونڈ نہ سکا۔ بچہ اس معاملے میں اپنے فن کی بلندیوں پر رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا میں گھڑسواروں کو مرنے نہیں دوں گا۔ میں انہیں زندہ رکھنا جانتا ہوں۔ یہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہمیشہ موجود رہیں گے۔“ بچے نے آخری معرکہ بھی سر کرنے لینے والے سپہ سالار کی آواز کی کھنک کی طرح کھنک کر کہا۔

”میں نے کہا تھا میں گھڑسواروں کو مرنے نہیں دوں گا۔ میں انہیں زندہ رکھنا جانتا ہوں۔“ یہ فقرہ عالیان کے اندر آسمان پر نکلنے والی دھنک کی طرح پھیل گیا۔

”اور اس کی چالی۔ یہ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔“ اس

کے اندر چھپ کر بیٹھے پرانے عالیان نے دعا کی کہ کاش بچہ اسے لا جواب کر دے۔

بچہ نے قہقہے کی سرسبز جود ہوتی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر سجایا۔

”اس کی چالی ہے میرے پاس۔ جو کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ یہ دیکھو۔“ اس نے وہ انگلی جو وہ گھوڑے کی ٹانگوں میں اڑس کر انہیں دوڑاتا رہا تھا اٹھائی۔

”یہ ہے اس کی چالی۔ میں ہوں اس کھلونے کی چالی۔“ کہہ کر اس نے گھوڑوں کو اس عظیم چالی کے ذریعے پھر سے دوڑایا اور مایوسی کے میدان میں امید کے گھڑسوار دوڑنے لگے۔ اس نے اسے لا جواب کر دیا تھا۔

بچہ نے منہ کھولا اور درخت کو اگل دیا۔ کیونکہ انسان پر یہ جائز نہیں کہ اپنے اندر وہ اسے جگہ دے۔ اس آج فنا کا چشمہ اس پر حرام کیا گیا ہے۔ حرام تر۔ ایک بچہ بھی جانتا ہے ٹوٹے ہوئے کھلونے کو کیسے چلایا جائے گا۔

”میں ہوں اس کی چالی۔“ گھڑسوار مقابلے کے جوش سے للکار اٹھے، گھوڑوں کی ٹاپوں نے دلدلی جنگلوں کو بھی پچھاڑ ڈالا۔ ان پر انسان سوار تھے۔ وہ انسان جو بزدلی اور کم ہمتی کے سمندر کو بھی پاٹ جاتے ہیں۔

”گھوڑے کو گرنے نہ دو۔ گھوڑسوار کو مرنے نہ دو۔“ اقوال یاد کر کے زندگی گزارنے کی کوشش کرتی بار گریٹ کو کاش کوئی یہ فلسفہ سکھا دیتا۔ اور اب وہ زندہ ہوتی اور اس کا بیٹا بل کے دہانے نہ بیٹھا ہوتا۔

”جو انسان روتا ہے وہ آسمانی فرشتوں کو رنجیدہ کر دیتا ہے۔“

”فرشتے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں ماما؟“

”انسان کو رونے کے لیے نہیں بتایا گیا۔ اس پر اشرف ہونے کا تاج سجایا گیا ہے اس تاج کو سجا کر انسان روئے گا تو رنجیدہ ہی کرے گا نا۔ انہوں نے انسان کی تخلیق دیکھی ہے اور وہ یہ کہے فراموش کر سکتے ہیں کہ انسان کو وہ علم و حکمت عطا کی گئی جو انہیں

سکتا ہے۔

”اور اس کی چالی۔ یہ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔“ اس

کر اس نے چلا کر کہا تھا اور آج رات کو کارل اسے زبردستی سڑک پر تھکھٹ لایا تھا۔ دونوں مٹرکشت کرنے لگے۔ آتے ہوئے کارل ایک ہال میٹ کا پتلا اٹھالایا تھا جو وہ اپنے کمرے میں ”اکیلا“ چھوڑ کر خود راسی دیر کے لیے اوھر اوھر ہو گیا تھا۔

”تم اپنے ٹھیک ہونے کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتے، جب تم چھوٹے تھے تب تم ایسے رہا کرتے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی میں پورا ٹھیک نہیں ہوں۔“

”چلو پھر یہ بتاؤ پورے ٹھیک کب ہو جاؤ گے۔“

”زندگی ایک عجیب مضمون ہے کارل۔“

”بالکل نہیں! زندگی ایک خالی مضمون ہے، یہ مضمون پڑھا جانے والا نہیں لکھا جانے والا ہے اسے ہم لکھتے ہیں، یہ زندہ دل ہوگا، رنگین یا کامیاب یہ ہم طے کرتے ہیں، یہ مشکل ہوگا، بے کاری یا فضول یہ بھی۔“

اس کا عنوان ہم ہیں ”میں کارل“ تم عالیان

مجھے دیکھو کیا تم نے مجھے کبھی روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے خود کو خود کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا، سینٹر میں جس دن تم سے شرارت کی تھی تمہاری رونی شکل دیکھ کر کی تھی ورنہ تم جیسے تھے ویسے بچے مجھے پسند نہیں تھے تم میرے مزاج کے نہیں تھے۔“

”جانتا ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں تمہارے ساتھ اتنا اچھا کیوں بن رہا ہوں برسوں۔ ایک دن چرچ میں سروس کے بعد فادر نے مجھے روک لیا میں خاموش اور اداس رہا کرتا تھا کافی چھوٹا تھا میں اس وقت۔ وہ کئی بار مجھے سمجھا چکے تھے کہ زندگی کو ایسے اداس ہو کر نہ گزاروں۔ اس دن انہوں نے میرے سامنے ایک

نہیں دی گئی۔ اگر انسان وہ منظر دیکھ لے جب کائنات کا رب اس کی تخلیق کا فیصلہ کرتا ہے اور نطفے میں جان ڈالتا ہے اور اسے پروان چڑھاتا ہے اور لوہے پر اس کا نام لکھا جاتا ہے اور فرشتوں کو اس بندے کے لیے ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں تو انسان صرف اور صرف اپنے مقصد حیات کے لیے جدوجہد کرے۔ وہ دکھ پر صبر کرے، نعمت پر شکر کرے۔ وہ زندگی کو بامقصد بنانے کو بندگی جانے۔ رتبوں میں سب سے پہلا رتبہ تخلیق میں لائے جانے کا ہوتا ہے اور ہر تخلیق پا جانے والے کو اس رتبے پر فخر و شکر کرنا چاہیے۔“

ماما مرنے سے اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا۔ اسے یہ یاد تھا۔ اسے وہ بھول گیا تھا تو ہی اس حالت میں یہاں بیٹھا تھا۔

”زندگی میں جو جذبہ آپ کو بریاد کرنے لگے اس جذبے سے دور ہو جائیں۔ کیونکہ انسان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی تخلیق کا فیصلہ خدا نے کیا ہے۔ وہ اپنا خدا خود نہیں بن سکتا وہ خود کو بریاد نہیں کر سکتا۔“

بچے کی پیشانی چوم کر عالیان وہاں سے اٹھ آیا۔ اسے مارگریٹ نہیں بننا تھا۔ اس کے پیچھے بچے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ ساز بجا رہا تھا۔ کیونکہ اس کھلونے کی چابی وہ خود تھا۔ اور وہ گھڑسوار اس وقت تک نہیں گر کر مریں گے جب تک وہ چابی سلامت تھی۔

زندگی کھیل نہیں ہے۔ زندگی میدان ہے۔ ابد کا میدان۔ اور ابد کی زندگی کے لیے۔ گھوڑے گرنے نہ دیں۔ گھڑسوار کو مرنے نہ دیں۔ یہ فرض ہے ورنہ انسان اشرف ہونے کا شرف کھودے گا۔ یہ حقیقت ہے۔

وہ مامی پوٹو اپس آیا تو رات ہو چکی تھی وہ اپنی جاب پر ہارٹ راک آگیا۔

”مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔“ کارل نے اس کی آکر گردن دو بوجلی تھیں۔

”دوبارہ ایسے عائب نہ ہونا۔“ اسے ایک گھونسا جڑ

گلاس توڑا، گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان ٹکڑوں پر ننگے پاؤں چلنا چاہوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ دکھ نوٹا ہوا گلاس ہے، کرچیاں اور ٹکڑے۔ ان پر چل کر تم خود کو زخمی ہی کر سکتے ہیں، جس جو ہو چکا ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ گلاس ٹوٹ چکا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا، ٹوٹے ہوئے گلاس کو اٹھاؤ اور باہر پھینک دو۔“

اس کی کرچوں پر خود کو تھمتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ کم عقلی اور بے وقوفی ہے جبکہ انسان سے ارفع توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ کارل سارا پراکھا چکا تھا اور خالی ڈبہ ڈسٹ بن ڈھونڈ کر اس میں ڈال چکا تھا۔

”یہ سب باتیں کر کے میں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ میں تم سے زیادہ سمجھ دار اور بہادر ہوں۔“

عالیان خاموش ہی رہا۔

”اگر تم اس کی وجہ سے اپ سیٹ ہو تو میں اسے یونی سے نکالوا سکتا ہوں۔“ کارل نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور تمہیں اس کی ٹوئیٹ لے لینی چاہیے تھی۔“

”کے کر مجھے دے دیتے۔“

”کے نکالوانے کا کہہ رہے ہو؟“

”امرحہ کو۔“ کارل کو حیرت ہوئی اس کے انداز پر

”کون امرحہ؟“

کارل خاموش اسے دکھاتا رہا پھر کندھے اچکا دیے۔

”کون امرحہ۔ دلچسپ۔“

”تم کس بارے میں بات کرنا چاہ رہے ہو کارل۔“

”ٹھیک ہے بات یہیں ختم۔ بلکہ سب ختم۔ پھر تم پہلے جیسے کیوں نہیں ہو رہے، ایسا لگتا ہے تمہاری کھال میں کوئی اور چل پھر رہا ہے۔“ کارل نے اس کی ناک کی چٹکی لی۔

”عالیان کی کھال میں عالیان ہی ہے۔“ عالیان نے اس کے دونوں کانوں کو ایک ساتھ مروڑا۔

”خود کو دھوکا دے رہے ہو؟“

”ایک دوڑ ہو جائے۔“ عالیان نے پیش کش

کی۔

کارل نے جان دار تقبہ لگایا ”بات بدل رہے ہو؟“

”چار۔ تین۔ دو۔“ عالیان نے انگلیاں اٹھائیں۔

”ایک۔“ کارل چلایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ عالیان بھی۔

اب بس یہی حل تھا۔ بھاگتے پھرتا۔ آنکھیں میچ لینا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا۔ راستہ بدل لینا۔ غیر حاضر ہو جانا۔ غیر ہی بنے رہنا۔ مشکل تھا مشکل سے ہی ہونا تھا۔

ابھی ان کی دوڑ پھل سے ذرا دور ختم ہی ہوئی تھی اور کارل جیت گیا تھا کہ ایک پاؤں میں اپنا اور ایک میں کسی دوسرے کا جوتا اپنے شاہ ویز کارل کے سامنے آیا۔ اتفاق سے اس کے دائیں ہاتھ میں باکسنگ گلوڑ تھا۔

”میرا پرا تم نے کھایا ہے؟“ وہ باکسنگ رنگ میں آیا۔

”نہیں تم سے کس نے کہا۔“ کارل پر سارے جہان کی معصومیت سبھی تھی۔

”تمہارے چمکیلے ریکارڈ نے۔ اب شرافت سے میرا براوا پس کرو۔“

کارل نے پورا جبر اکھول دیا ”دیکھو کیا اس میں سے تمہارا براوا ہو کر گزرا ہے۔“

شاہ ویز نے منہ پھیر لیا اور ناک پکڑ لی۔ ”یہ باکسنگ گلوڑ تم دیکھ رہے ہونا اور تم جانتے ہو عامر خان میرا پسندیدہ باکسر ہے۔ تم مجھے اکسارہ ہو کہ میں اسے اسی سڑک پر خراج تحسین پیش کروں۔“ اس نے باکس کی طرح اچھل اچھل کر کہا۔

”بڑی تم عالیان سے پوچھ لو۔ میں نے تو دو ہفتوں سے بڑا کی شکل نہیں دیکھی۔“

”جبکہ ان دو ہفتوں میں پورے دس ہزار ہال سے عائب ہوئے ہیں۔“ شاہ ویز نے دائیں ہاتھ کو لہرا کر کہا۔

کارل نے اس سے اپنی ناک چٹائی۔

”اس نے ہی پرا کھایا ہے۔“ عالیان نے کہا۔

کارل کو ذرا حیرت نہیں ہوئی اسے عالیان سے یہی

توقع تھی۔ شاہد ویز نے ہاتھ پھر لہرایا، مکالمے کے لیے نہیں بلکہ مکے کی متوقع آمد کی خبر دینے کے لیے۔
”جو Testoni کے جوتے تم نے مارک کورینٹ پر دیے تھے میں احتیاطاً انہیں اس کی وارڈروب سے نکال کر اپنی وارڈروب میں لاک کر آیا ہوں۔“
عالیان ہانگوں کی طرح ہنسنے لگا کہ اب کارل تم کیا کرو گے۔ کارل خاموش سا شاہد ویز کو دیکھنے لگا اس کے جوتے برا سے مہنگے تھے۔
”اب تم پرالے آنا اور جوتے لے جانا جب تک پڑا نہیں آئے گا کافی گھنٹہ جوتوں پر ہر جانہ پڑھتا جائے گا۔ ایک گھنٹہ بعد آنے کی صورت میں میں دو دن جوتے استعمال کر کے تمہیں دوں گا۔ اور میں یہ بتا دوں کہ انہیں پن کر میں فٹ بال کھیلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“
شاہد ویز نے خلائی مکالمہ کر کہا۔
”Hmmm۔“ کارل نے شاہد ویز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”پچھلے ہفتے تم نے جیری کو اپنا پنڈی کیم استعمال کے لیے دیا تھا۔ جیری اتنا لاپرواہ ہے کہ اسے اسٹڈی نیبل پر ہی رکھتا ہے۔“
کارل نے تیزی سے کہا اور ہال کی طرف دوڑ لگا دی جب تک شاہد ویز کو بات سمجھ میں آئی تھوڑی سی دیر ہو چکی تھی پھر بھی وہ کارل کے پیچھے تیزی سے بھاگا لیکن کارل ہال کا داخلی دروازہ پار کر چکا تھا۔
”اور میں یہ بتا دوں کہ میں پنڈی کیم کو منسلک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ کارل نے بھاگتے ہوئے چلا کر کہا۔
عالیان نے بھی دونوں کے پیچھے بھاگنا مناسب سمجھا کہونکہ اس کا ارادہ شاہد ویز کی مدد کرنے کا تھا۔

اسلامی اسٹوڈنٹ سوسائٹی اسلام کو لے کر ایک ڈاکو منٹری بنوا رہی تھی جس کا ذمہ ڈیرک کو دیا گیا تھا۔ ڈیرک نے ظاہر ہے امرجہ کو بھی ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی جو امرجہ نے قبول کر لی۔ ڈاکو منٹری کا موضوع مختلف مذاہب کے اسٹوڈنٹس کے خیالات

جاننا تھا جو وہ اسلام کے لیے رکھتے تھے۔
ڈیرک اور اس نے مل کر سوالات لکھے۔ انہیں کم سے کم چالیس اسٹوڈنٹس سے سوالنامے کے جوابات لینے تھے۔ ڈاکو منٹری کا دورانیہ بیس منٹ تھا۔
ریکارڈنگ کے لیے انہوں نے مختلف اسٹوڈنٹس سے رابطے کر لیے تھے۔

کچھ ریکارڈنگ یونیورسٹی کیمپس میں کی جانی تھی کچھ یونی کے باغ میں، اسٹوڈنٹس ہالز اور کچھ قریبی کیفے اور سڑک پر۔
ریکارڈنگ شروع ہوئی تو تقریباً سب نے ہی ان کے ساتھ تعاون کیا اپنے خیالات کے اظہار کے لیے وہ آزاد تھے اور وہ آزادانہ ہی اظہار کرتے تھے۔ کچھ اسٹوڈنٹس کے تاثرات کافی منفی اثرات لیے ہوئے تھے کہ امرجہ سختی سے اپنے لب بھینچ لیتی اسلام کو لے کر اتنی غلط فہمیاں پروان چڑھ چکی ہیں اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ مغربی لوگ حالات سے باخبر رہتے ہیں یہ ایک سچ ہے لیکن اس سے بھی بڑا سچ وہ میڈیا ہے جو انہیں اپنی مرضی کے جھوٹ سچ دکھاتا ہے۔ ایک اسلامی ملک پاکستان میں میڈیا کی لگائیں کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں تو کسی دوسرے ملک کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کے خلاف جتنی بھی غلط فہمیاں پاپروپیگنڈہ ہو چکا ہے اس کو لے کر مسلم امہ نے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ جو بنایا ہے وہ بہت کمزور ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ مسلم امہ مل بیٹھ کر اس بارے میں سوچے اور کچھ کرے۔ کچھ تو۔ کہ اسلام پر لگے دہشت گردی کے الزام سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

لیکن ہو یہ رہا ہے کہ سب بیٹھے تو ہیں لیکن مل کر نہیں، شخصی سطح پر بہت کیا جا رہا ہے لیکن ایک قوم کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ سیاہ دھبہ دن بدن پھیلتا ہی جا رہا ہے گھروں میں بیٹھے ہاتھوں میں فون لیے ہم صرف اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کے خلاف لے لے لے کھنٹس ہی کر سکتے

ہیں یا مختلف گروپس اور جزیروں کے لیے یہ ہے ہمارا سارے کا سارا جہاد اور یہ ہے ہماری اسلام کے حق میں جنگ۔ کافی کے مگ سے کافی پیتے۔ اسلام، اسلام کرتے۔ اسلام کے حق میں پوسٹ شیئر کرتے، تصویریں اپ لوڈ کرتے اور زیادہ ہو تو پروفائل پکچر تبدیل کرتے۔

”اسلام کے لیے خدمت تمام ہوئی۔“ لاگ آف ہوئے اور سو گئے، یانی دی آن کر لیا۔ جاپانی اور جرمن دوسری جنگ عظیم میں متوجہ رہے تھے یہ ماضی ہے، جاپانی اور جرمن ترقی کے ہر میدان کے فاتح ہیں۔ یہ حال ہے۔

”ہر قوم خود پر ٹوٹنے والے افتاد سے سبق سیکھتی ہے اس افتاد سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے۔ مسلم قوم کیوں نہیں؟“

”جنگ عظیم دوم کے دوران جاپانیوں کو وحشی اور درندے کہا گیا۔ اور اب۔ اور آج دنیا میں انہیں ”دنیا کی امن پسند قوم“ کی صف میں سب سے آگے کھڑا کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی انسان ایک جاپانی سے زیادہ امن پسند نہیں ہو سکتا۔“

”تقدیریں بدل جاتی ہیں اگر قومیں بدل جائیں اور قومیں صرف اسی وقت بدلتی ہیں جب ان کی سوچ بدلے۔ اور سوچ اس وقت روشن ہوتی ہے جب جہالت کا اندھیرا چھٹ جائے۔ اور جہالت کا اندھیرا چودہ سو سال پہلے قرآن کی تکمیل سے مٹ چکا ہے۔

اس منادیے گئے اندھیرے کے بعد بھی ہم جاہل ہی رہیں تو توف ہے ہم پر۔ پھر بھی ایک قابل فخر قوم نہ بن سکیں تو ”خسارے میں ہیں ہم۔ قوموں میں قوم نہ کہلا سیں جائیں تو ”دھبہ“ ہیں ہم۔“

”اندھے گونگے اور بہروں کے لیے کوئی وعدہ نہیں ہے۔ کامرانی کا نہ شجاعت کا۔“

پال کا تعلق یونان سے تھا وہ تقریباً ”لانڈھب ہی مشہور تھا، یونیورسٹی میں وہ اپنے تیز مزاج کی وجہ سے جانا جاتا تھا اسے تخریبی ذہن کا مالک بھی کہا جاتا تھا۔ ڈاکو منٹری کے لیے جب اسٹوڈنٹس سے رابطے کیے

گئے تو اس نے ڈیرک سے ریکارڈنگ کی خواہش کا اظہار کیا۔ کیمرہ آن ہوتے ہی اس نے اسلام کو لے کر انتہائی شدت پسندانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ ڈاکو منٹری کے لیے آزادی رائے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ایسا گراہوا انداز اپنایا جائے۔

ریکارڈنگ Oak ہاؤس کے باغ میں کی جا رہی تھی۔ ڈیرک نے کیمرہ بند کر دیا تو وہ ضد کرنے لگا کہ اسے آزادی رائے کا حق پوری طرح سے استعمال کرنے دیا جائے۔

”تمہارا انداز مناسب نہیں ہے۔“ ڈیرک نے تحمل سے کہا۔

”کیوں! میرے انداز کو کیا ہوا ہے؟“ وہ چڑ گیا۔

”تم الزامات لگا رہے ہو۔“

”کیا الزام لگایا ہے؟“

”مجھے تم سے بحث نہیں کرنی۔“ ڈیرک نے بات ختم کی۔

”تم میری بے عزتی کر رہے ہو؟“ وہ بلاوجہ غصے میں آ گیا۔

”اور تم جو اتنی گھٹیا زبان کا استعمال کر رہے ہو۔ شکر کرو۔ میں نے تمہارا منہ نہیں توڑ ڈالا۔“ امرجہ بولے بغیر وہ نہ سکی جبکہ ڈیرک نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔

پال اور بھڑک اٹھا کہ گالیاں دینے لگا اور امرجہ کو مخاطب کر کے اسلام کی ہتک کرنے لگا۔

ڈیرک نے امرجہ کو چلنے کا اشارہ کیا لیکن امرجہ ہلی نہیں۔

”مجھے سن لینے دو اس کی بکواس۔“ امرجہ غصے میں چلائی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے امرجہ! چلو۔ عقل سے کام لو۔“

لیکن امرجہ نے عقل سے کام نہیں لیا اور وہ پال کی بکواس سنتی رہی۔

”امرجہ! خدا کے لیے چلو۔“ ڈیرک منت کرنے لگا

وہ امرجہ کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
”جاہلوں سے بحث نہیں کرتے امرجہ!“ ڈیرک
نے اسے سمجھانا چاہا۔

”یہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہے جاہل نہیں۔“ امرجہ
غصے سے بولی۔

”تم یہاں سے چلو بس۔“

پال مسلسل الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا اس سے
ایسے سوال پوچھ رہا تھا۔ جن کے جواب میں خاموش رہا
جاسکتا تھا یا اس کے منہ پر پھینک مارے جاسکتے تھے اور
جب اس نے مقدس ہستیوں کو لے کر زہرا گلا تو امرجہ
نے یکدم اس کے منہ پر کس کر ایک چائنا ڈسک مارا۔
”بکواس بند کرو اپنی ذلیل انسان۔“ امرجہ کی
برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

ڈیرک ایک دم سے پال اور امرجہ کے درمیان آیا۔
”امرجہ! بھاگو یہاں سے۔“ ڈیرک چلایا۔ پال
کسی پھینکے کی طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ کچھ دوسرے
اسٹوڈنٹس ڈیرک اور پال کی طرف بھاگے جو جھٹکے گئے
ہو رہے تھے۔ پال امرجہ کی گردن دیوچ لینا چاہتا تھا۔
امرجہ زردی ہو گئی اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
زرا سی دیر میں صورت حال بدل گئی تھی۔ اور
انتہائی خوفناک صورت حال اختیار کر گئی تھی۔ اس
نے یونیورسٹی کے ایک اسٹوڈنٹ کو تھپڑ مار دیا تھا
صرف اس ایک تھپڑ کو لے کر پال اسے یونی سے نکلوا
سکتا تھا۔

امرجہ گھر آگئی۔ ویرا اسے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔
”گھنٹے بعد ڈیرک کا اسے فون آیا وہ اسے اسٹوڈنٹ
یونین کے دفتر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ یونین کے
آفس آگئی۔ ڈیرک نے فوراً ”سے پہلے معاملہ یونین
کے سپرد کر دیا تھا۔“

ساری صورت حال صرف ایک اسٹوڈنٹ کے
خلاف جانے والی تھی ”امرجہ کے“ ڈیرک اسے منع
بھی کر رہا تھا کہ پال کو بولنے دے اور وہ وہاں سے چلی
جائے لیکن امرجہ سے اپنا غصہ دبایا نہیں جاسکا اس نے
پہلی بار براہ راست ایسا کچھ سنا تھا وہ بھی اپنی ہی یونی کے

اسٹوڈنٹ کے منہ سے۔
یونین کے صدر ”اسلامی سوسائٹی کے صدر اور
پاکستانی سوسائٹی کے صدر نے ان تینوں سے پہلے الگ
الگ بات کی۔ پھر اسٹوڈنٹ یونین کے چند دوسرے
فعال لیکن بہت ہی سمجھ دار اسٹوڈنٹس کی موجودگی میں
مینٹنگ کی گئی۔

یونین کے صدر جے پیٹرمن نے امرجہ کے عمل کو
ختم ناپسند کیا۔
”وہ بکواس کر رہا تھا۔ میں برداشت نہیں کر سکی۔“
امرجہ کو جے پیٹرمن کے رد عمل پر اور غصہ آیا۔

”بہر حال اس نے اپنی زبان کا استعمال کیا۔ آپ
نے ہاتھ کا۔ آپ کا رد عمل سنگین ہے۔ آپ جانتی
ہیں اس بنا پر وہ آپ کو یونیورسٹی سے نکلوا سکتا ہے۔“
”مالی فٹ۔“ اگر اس نے دوبارہ بھی ایسی بکواس کی
تو میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔“ مینٹنگ میں موجود ایک
ایک شخص نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
”آپ اپنے مذہب کے کس اصول کے تحت اس کا
منہ توڑ دیں گی۔“ عالیان اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تشدد کی تو اسلام میں گنجائش ہی نہیں ہے۔
انتہائی حد پر جا کر بھی۔“ ”اور ایسی فضولیات کی
گنجائش ہے؟“ امرجہ کو عالیان کی بات بری لگی اسے
یہ بھی برا لگا کہ اتنے سارے لوگوں میں وہ اسے غلط
ثابت کرنا چاہ رہے ”نہیں ہم نہ پال کے رد عمل کے
حامی ہیں نہ ہی آپ کے۔“ جے پیٹرمن نے کہا۔

”لیکن آپ سب صرف مجھے ہی غلط کہہ رہے ہیں۔“

”آپ غلط ہیں۔“ عالیان نے سنجیدگی سے کہا۔
امرجہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ تو وہ اسے اس
قدر ناپسند کرنے لگا تھا۔ غصے اور دکھ کے لاؤنے اس پر
ہلا بول دیا۔ وہ جیسے عقل سے بیگانہ سی ہو گئی۔

”ہونہ۔“ یونین کی اس مینٹنگ کے ارکان عیسائی
ہیں یا یہودی۔ یا لائف بوب وہ کیسے میری حمایت کر سکتے

ہیں۔ ایک مسلمان کو وہ کیسے ٹھیک کہہ سکتے ہیں
۔۔۔ امرجہ کا دماغ واقعی کام کرنے لگا تھا۔

عالیان نے حتیٰ سے اپنے لب بھینچ لیے۔ اس نے
اتنی ناپسندیدگی سے امرجہ کو دیکھا کہ اس نے آج تک
شاید ہی کسی کو دیکھا ہو گا۔

”یونین کے ارکان سمجھ دار پڑھے لکھے انسان ہیں
۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں یہاں ہم سب مذہب سے
بالا تر ہو کر بات کر رہے ہیں۔ ہم مسئلے کے حل کے
لیے آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کو سمجھانے کے
لیے۔ آپ کی غلطی ہے آپ مان جائیں۔ پال سے
مفاہمت کر لیں۔“

”ہرگز نہیں۔“

”آپ کو اس سے پہلے معذرت کرنی ہوگی آپ کر
لیں۔ وہ بھی کر لے گا۔ ورنہ اس معاملے کو ہم
یونیورسٹی انتظامیہ تک جانے سے نہیں روک سکیں
گے۔“

”جو ہو گا وہ میں دیکھ لوں گی۔ میں اس سے
معذرت ہرگز نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ یونیورسٹی انتظامیہ کے
پاس ہی جانا چاہیے پھر۔ مس امرجہ کا یونیورسٹی سے
چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔“ ”عالیان کی کرخت آواز تھی
جسے سن کر امرجہ بلبلایا سی لگی تھی۔

ہاں وہ اس سے شدید نفرت ہی تو کرنے لگا ہے اب۔

مینٹنگ بغیر کسی نتیجے کے برخاست ہو گئی۔ امرجہ
نے اسٹوڈنٹ یونین کے آفس سے باہر نکلتے عالیان کو
جالیا۔

”تو تم مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگے ہو کہ مجھے
ایسے یونیورسٹی سے نکلوانا چاہتے ہو؟“

”میں تمہیں نکلوا رہا ہوں؟“

”تم نے جے پیٹرمن سے کہا کہ۔“

”ہاں۔ میں نے کہا۔ اور ٹھیک کہا۔“

”میرا یونیورسٹی سے نکل جانا بہتر ہے۔“ وہ سن
چکی تھی پھر بھی تصدیق چاہی تھی۔

”بالکل۔“ اس نے تصدیق کر دی۔
امرجہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ ”اتنی نفرت اب
اس سے۔“

”تم مسلمان ہوتے تو تمہارے دل پر چوٹ لگتی۔
صرف نام رکھ لینے سے اور چند کتابیں پڑھ لینے سے
کوئی مسلمان نہیں بن جاتا۔ جس طرح کی بکواس
اس نے کی تھی وہ قتل کے جانے کے لائق تھا۔“
عالیان کے رویے سے بھڑک کر امرجہ نے اس پر گہری
چوٹ کی۔

عالیان نے بہت صبر سے امرجہ کو دیکھا جیسے
کسی جاہل کو علم کی نظر سے جانچا۔

”ایسے کتنے قتل ہوئے تھے اس دور میں جس میں
محمدؐ پر پتھر برسائے گئے تھے؟“ وہ سوال کر رہا تھا امرجہ
اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”بتاؤ۔ جواب دو۔ جب ان کے جوتے خون سے
بھر گئے تھے۔ انہیں برا بھلا کہا جاتا رہا۔ جب وہ اپنی
قوم کے پاس واپس آئے تو انہوں نے اپنی قوم کو کیا حکم
دیا تھا۔ ملیا میٹ کر دو ان لوگوں کو جنہوں نے مجھے برا
بھلا کہا۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بچاؤ۔ کیا ایسا کوئی
حکم دیا تھا انہوں نے؟“

غصے میں بھڑک جانے والوں میں سے ایک کے
پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

”کیا اس عورت کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا تھا جو
ان پر گند پھینکا کرتی تھی۔ ایک اللہ کا پیغام پھیلانے
والے کے سامنے جب مشرک جاہل اللہ کو برا بھلا کہتے
اور مذاق اڑاتے تو کیا وہ غصے میں بھڑک کر ایک ایک کا
منہ توڑ دیا کرتے تھے۔ جو اللہ کے نبی تھے جو تم سے
زیادہ اللہ کے قریب تھے کیا وہ یہ کہا کرتے تھے؟

ساری دنیا میں اسلام کا تماشا تم جیسے بھڑک بھڑک
جانے والے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ تم مسلمان ہونا
۔۔۔ اسلام کو ماننی ہو۔ پھر غصے میں بھڑکنے کی وجہ۔
غصہ تو حرام ہے نا۔ ہر حال میں حرام۔ حرام کا
مطلب حرام۔ کبھی حرام کو حلال ہوتے دیکھا ہے۔
کسی بھی صورت کسی بھی ماحول میں۔

غصے میں برا بھلا کہنا، گریبان پھیلانا، تشدد کرنا۔ یہ کون سا مذہب ہے جس کی تصویر اٹھا کر تم دنیا کو دکھا رہی ہو؟ تم نبی کے نام پر جان دینے کو تیار ہوگی لیکن کو بھی تیار ہوگی، لیکن اسی نبی جیسی بننے پر تیار نہیں ہوگی۔

اسن پسند یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے، لیکن پھر یہ اسن پسند نہ رہتی۔ تمہاری ذرا سی غلطی کا نقصان کتنا بڑا ہوتا ہے اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔

”تو کیا اس نے ٹھیک کیا؟“ امرجہ کی آواز رندہ گئی۔

اسلام اینٹ کا جواب پتھر نہیں ہے مس امرجہ۔ بالکل نہیں۔ اسلام اینٹ کا جواب برداشت ہے، تحمل ہے، صبر ہے، حکمت ہے اور سب سے بڑھ کر خاموشی ہے۔

اسلام گلی کا جواب گلی نہیں ہے۔ اسلام گلی کا جواب درگزر ہے۔

کیا تم نے درگزر کو اپنایا۔ کس نبی نے کب درگزر سے کام نہیں لیا، کب کب خاموشی اختیار نہیں کی، نبیوں کے لیے سب سے زیادہ صبر خاموشی، حکمت کے پیغامات اترے ہیں نبیوں نے یہی درس اپنی امتوں کو دیے ہیں۔ تم کس نبی کو مانتی ہو۔ تم کس دین کی پیروی کر رہی ہو۔ تم میں برداشت نہیں۔ تم میں صبر نہیں۔ تم کون ہو؟

کل پوری انسانیت وحشی پن پر اتر آئے تو بھی اسلام اس کی مخالفت کرتا ہے اپنے برائے نام اسلام کو صرف خود تک رکھو۔ بھڑک کر اسے مار کر تم نے ثواب نہیں کمایا۔ تم اسے بولنے دیتیں۔ کیا اس کے کہہ دینے سے وہ سچ ہو جائے گا جو جھوٹ ہے۔ غلط ہے تم جانتی ہو کہ یہاں کیا ہو سکتا تھا۔ بارود کے ڈھیر پر تم نے چنگاری پھینک دی تھی۔ پال کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ وہ ایک اسپورٹس پرسن ہے۔ پونی اسے سپورٹ کرتی ہے، اس کے کئی چاہنے والے ہیں، یہاں ان سب سپورٹرز کو ملا کر اس نے تمہارے خلاف۔ یعنی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر لیا تھا عرب اور افریقہ کے مسلمان اسٹوڈنٹس ان معاملات میں بہت حساس ہیں وہ بھی ایک محاذ بنا لیتے۔ ایک ایسی جگہ جہاں مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی اور دیگر مذاہب کے اسٹوڈنٹس بھی وہاں مذہبی آگ بھڑک اٹھتی۔ ماچسٹر یونیورسٹی دنیا کی

اس کی ساری باتیں ٹھیک تھیں اور ایک بات سب سے زیادہ ٹھیک تھی کہ اب وہ واقعی ”امرجہ“ کو نہیں جانتا تھا۔ اسے اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

امرجہ جاب پر نہ گئی اور سڑکوں پر مڑ گشت کرتی رہی۔ رات ہو گئی اور رات سے اور رات۔

جے پیٹرسن کو اس نے فون کر دیا تھا وہ پال سے

مفاہمت کے لیے تیار تھی۔ ماچسٹر کی ایک ایک چیز جو اسے اچھی لگا کرتی تھی اسے زہر لگ رہی تھی اس کا دل کہیں دور بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ کہیں چھپ جانے کو کہیں بھی موجود نہ ہونے کو۔

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اسے خود کے ساتھ کیا کر لینا چاہیے۔

کشتی کے پینڈے میں ہوئے سوراخ کی مانند۔ وہ سمندر کے کھارے پانی سے خود کو بچا لینے پر قادر نہ رہی تھی۔ اور وہ تو اس پر بھی قادر نہیں رہی تھی کہ کسی طرح سے اس سوراخ کو ہی بند کر ڈالے۔

تو اسے ڈوب ہی جانا تھا۔ اگر یہی طے تھا تو اسے زیادہ مچلنا نہیں چاہیے پر سکون رہنا چاہیے۔ لیکن اس سے یہ بھی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ داخلی طور پر ایک مشکل دور سے گزر رہی تھی اور اس کا الزام وہ صرف اپنے سر پر نہیں لے سکتی تھی کہ سب اس کی وجہ سے ہوا اور اس میں سراسر اسی کا تو تصور ہے۔



وہ جے پیٹرسن کے پاس موجود تھی۔

”میں سارے معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔“

”ڈاکٹر منڈی پر فی الحال کام نہیں ہو گا۔ یا آپ لوگ اسے ریلیز نہیں کریں گے۔ اس سارے معاملے سے آپ کسی کو آگاہ نہیں کریں گی اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں، ورنہ منڈی کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔ آپ کسی کو کسی بھی صورت میں بتائیں گی کہ پال نے کیا کیا کہا۔“

Tab Manchester

The یا کسی بھی دوسرے اخبار تک یہ بات کسی بھی صورت میں نہیں جانی چاہیے۔ آپ بالکل خاموش رہیں گی۔ کوئی کچھ بھی پوچھے گا تو آپ لا علمی کا اظہار کریں گی۔ پال چاہتا ہے آپ اس سے معذرت کریں۔“

”پہلے معذرت وہ کرے گا۔ پہل اس نے کی تھی۔“

ٹھیک ہے کل اپنی پہلی کلاس لینے کے بعد یہاں

آجائے گا۔“

جے پیٹرسن سے ملنے کے بعد امرجہ عالیان سے ملنے اس کے ڈیپارٹمنٹ آئی لیکن وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکی۔ ناچار وہ سائیکل اسٹینڈ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اپنی کلاسز لے کر جب وہ اپنی سائیکل کے پاس آیا تو وہ فوراً اس کے پاس آ گئی۔

”میں اپنے رخ روپیے کی معذرت چاہتی ہوں عالیان!“

”جے پیٹرسن نے مجھے بتایا ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“ عالیان نے اس سے ٹھیک ویسے ہی بات کی جیسے جے پیٹرسن نے امرجہ سے کی تھی۔

”میں اس معاملے کی نہیں۔ تمہاری اور اپنی بات کر رہی ہوں۔“

”تمہاری اور میری کوئی بات نہیں ہے جسے کیا جائے۔“ سائیکل نکال کر وہ آگے بڑھ گیا اور اس پر بیٹھ کر اتنی شدت سے پیڈل گھمایا جیسے کسی پرانے صدمے کو نئے انداز سے دافع کرتا ہو۔

امرجہ نے غصے میں اس پر طنز کیے تھے کہ وہ لائڈز ہب ہے یا صرف نام کا مسلمان ہے، لیکن نام کا مسلمان وہ نکلا تھا یا خود امرجہ، امرجہ کو خدشہ رہا تھا کہ وہ حرام فوڈ کھا تا رہا ہو گا۔ اور امرجہ حرام کی قسم غصے میں کئی ہزار بار جھلا ہو چکی تھی۔ وہ ہاتھ سے کھانے والے کھانے کو ہی حرام کہتی تھی اور اس حرام کا کیا جو غصہ غیبت اور چغلی کی صورت وہ کئی سو بار کھا چکی تھی۔ اسے اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا لیکن یہ کیسا فخر تھا جو صرف نام کا تھا۔

لیڈی مہر کا کہنا تھا کہ وہ چاہتا تو اپنی ماں کا مذہب اپنا سکتا تھا لیکن اس نے میرا مذہب اپنایا۔ اس پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی تھی، بالغ ہونے کے بعد اختیار اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اسلام کا انتخاب کیا۔ وہ ایک عام مسلمان نہیں ہے۔

لیکن امرجہ نے اسے عام بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ ایک عیسائی عورت کا بیٹا ہے یورپ میں پلا بڑھا ہے، اس کے باپ کا تاپتا نہیں تھا اس کے ساتھ دوستی کی جا

سکتی ہے۔ رشتہ داری نہیں وہ خوب صورت ہے۔ لائق فائق ہے سمجھ دار، بردبار ہے لیکن پھر بھی پاکستانی معاشرے میں صفر ہے، کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی اور اس کا باپ سولہ۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اسے ایک مسلمان عورت نے پالا ہے اور اس کی پرورش ایک بے سارا بچوں کے سینئر میں ہوئی ہے۔ صرف ان چند باتوں سے ہی ماچسٹر یونیورسٹی کا ٹاپر صفر ہو جاتا ہے۔

”اس نے ٹھیک کہا امجد! اسلام گالی کا جواب گالی نہیں ہے۔ بلکہ کتنی پیاری بات کی ہے اس نے۔“

دادا امجد کو سمجھا رہے تھے۔

عالیان کو صرف ایک یونیورسٹی فیلو ثابت کر کے اس نے دادا کو ساری بات بتا دی تھی۔

”میں بھی غلط نہیں تھی دادا۔ جو میں نے سیکھا دیکھا وہی میں نے کیا۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی ایسی باتیں نہیں سنی۔ کیسا محل اور کیسی بردباری۔ یاد ہے اماں اور بابا کے لڑا کرتے تھے۔“

”تم اماں بابا اور ماحول کو چھوڑو۔ بتاؤ کیا میں نے تمہیں یہ سب نہیں سکھایا۔ میں نے تم میں بردباری اور تحمل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب تم ماچسٹر جارتی تھیں تو میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ امجد دوسروں کے لیے مثال بننا کہ تم اب ایسی نہیں اپنے ساتھ اپنے ملک و مذہب کا نام لے جا رہی ہو۔ تمہارا ایک غلط قدم تمہاری قوم پر انگلی اٹھائے گا۔ تم نے کتنی بار مجھے کہا کہ دادا روسی بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ جبکہ روسیوں کے نام پر تم صرف ایک ویرا کو جانتی ہو۔ تم نے کہا کہ جرمن بہت صلح جو اور امن پسند ہوتے ہیں جبکہ تمہارا صرف ایک ہم جماعت بزمین ہے۔ تم نے کہا کہ جدت فرانیوں پر ختم ہے۔ تم بمشکل ایک یا دو فرانیسیوں کو جان پائی ہوگی۔ پال بھی تم ہی سے سارے مسلمانوں کو تشبیہ دے گا۔ تم خاموشی سے چلی آئیں تو وہ کہتا ہے شک خود سے ہی کہ مسلمان خاموشی سے نظر انداز کرنا جانتے ہیں۔ تم نے الٹا یونین کے صدر پر طنز کیے امجد ایک بات

یاد رکھنا اور ایسا تاقیامت ہو گا جہاں ایک بچہ ہو گا وہاں اس کے سو مخالف ضرور ہوں گے۔ ہم لڑکر بھڑک کر دوسروں پر یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم سچے ہیں۔ صرف ہمارا مذہب سچا ہے۔“

”ٹھیک ہے دادا۔“

”تمہاری آواز اتنی بوجھل کیوں ہے؟“

”ٹھیک ہے آپ کو ایسے ہی لگ رہا ہے۔“

”میرے خواب میں تم روتی ہوئی آئی تھیں۔ اگر تم روتی رہی ہو تو مجھے وجہ بتاؤ۔ کیا اس مسئلے کو لے کر پریشان تھیں؟“

”میں کیوں روؤں گی بھلا۔؟“

”امجد بچے! تم یہ بھول جاتی ہو کہ میرا دل تمہارے دل سے جڑا ہے۔ میرا دل اداسی سے بھرا جا رہا ہے۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ تمہارا دل اداس ہے۔ میں اپنے دل سے تمہارے دل کا حال جان جاتا ہوں۔“

”آپ کا وہم ہے۔“

”میں دعا کروں گا یہ میرا وہم ہی ہو۔“

”ہاں ضرور دعا کیجئے گا۔ کہ سب وہم ہی ہو۔“ اس نے فون بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔

اگر ایک دل دوسرے دل سے جڑ جائے تو سب معلوم ہوتا رہتا ہے؟ سب۔ لیکن اگر وہ جڑ جائے تو ہی نا۔

شارٹ اپنے نمونے کو لے آئی تھی اور کیا نمونہ لائی تھی کہ نشست گاہ میں بیٹھی این اون تک نظریں چرا کر جوڑن کو دیکھ رہی تھی جو خود لڑکاسی بنی گھوما کر بیٹھی اور جسے ”لڑکانا می مخلوق“ سے اتنی ہی دلچسپی تھی کہ ”بس یہ بھی ایک مخلوق ہے۔“

سادھنا خاص امجد کو اس کے کمرے سے نکال کر لائی تھی۔

”میں نے اب تک کی زندگی میں اتنا خوب صورت انسان نہیں دیکھا۔“ سادھنا نے جوڑن کی طرف انگلی

سے اشارہ کرتے ہوئے آہ صورت کہا۔

امجد نشست گاہ سے ذرا دور کھڑی جامد سی ہو گئی۔

”میں نے اتنی بڑی یونیورسٹی میں اس کے قریب قریب کا بھی نہیں دیکھا۔“

سادھنا نے امجد کے بازو پر چٹکی بھری ”ہم اسے نظر لگا دیں گے۔“

”نظر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

جانے کس دل سے خواہش کی تھی ماما مرنے کہ شارٹ ہالی ووڈ کا ہیرو ہی اٹھالائی تھی۔ چند ایک فلموں میں چھوٹے بڑے کردار ادا کر چکا تھا۔ بڑے بھی کر رہی لے گا اور سیراشار بن ہی جائے گا۔

ماما مرنے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس گڈے کو کس شوکیں میں سجا کر اس شوکیں کا دنیا بھر کے سامنے افتتاح کریں۔ یا ایک بڑی سی نمائش رکھ لیں کہ دیکھو میرا داماد۔ ہے کسی کے پاس ایسا۔؟“

”تمہیں کہاں ملا شارٹ؟“ ماما مرنے سرگوشی کی

این اون نے کان خاص ان کے قریب کر لیے۔

اف یہ سچ ہے اسے بھی معلوم کرنا تھا کہ ایسے چینی مٹی سے ہاتھ لگائے کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے جیسے گڈے کہاں پائے جاتے ہیں۔

بارور ڈیوٹی سے ماما جوڑن ایک شارٹ کورس کے لیے آیا تھا، کورس کیا اور چلا گیا پھر کچھ مہینے بعد آیا اور مجھے یہ انگوٹھی پہنا دی۔ ”اس نے انگوٹھی والا ہاتھ آگے کیا، اگر نشست گاہ کی سب لائنیں بجا دی جائیں تو انگوٹھی میں جڑا ہیرا بتاؤ کہ اس کی قیمت کیا ہے وہ اتنی دہشتوں میں بھی اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔“

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اس نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔“

شارٹ کا منہ اتر گیا۔ وہ بلاشبہ خوب صورت تھی لیکن جوڑن جتنی بہر حال نہیں۔ لیکن ماؤں کو تو صرف اپنے ہی بچے پیارے لگتے ہیں نا۔

”کتنی خوش قسمت ہوں میں شارٹ!“ ماما مرنے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ ٹھوڑی تلے نکائے۔

امجد نے ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے منہ پھیر لیا البتہ سادھنا کو نشست گاہ سے جانا پڑا۔ کیا انداز تھا ماما مرنے کا۔

”فلمی ستارے آئیں گے۔ بولو مجھے شادی کے انتظامات کرنے ہیں۔ انجلینا جولی، بریڈیٹ کے آنے کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟ صرف خاندان کے لوگ ہوں گے یا قریبی دوست۔“

اور میڈیا۔ میڈیا آئے گا۔“

شارٹ کی گلابی رنگت پیلی سی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں گھما کر جوڑن کی طرف دیکھا کہ وہ ان کی طرف متوجہ تو نہیں۔ بالکل نہیں ماما جوڑن کو یہ سب پسند نہیں۔

”لیکن مجھے پسند ہے یہ شارٹ۔ تم جانتی ہو میری کتنی بڑی خواہش تھی کہ میرا کوئی بچہ ہالی ووڈ اشار بنے لیکن کتنے بڑے وہم سب۔ سوائے عالیان کے کوئی آؤیشن دینے نہیں گیا اور میری قسمت دیکھو وہ آؤیشن میں ناکام ہو گیا، ویسے وہ ہر جگہ ٹاپ کرتا ہے۔ شارٹ میری مانو تو ملی اب تو مجھے ایک بتا بنایا ہیرو مل گیا ہے۔ مجھے مت روکو۔“

”ٹھیک ہے ماما! حکے سے بلوا لیجئے گا۔“ شارٹ نے کان کے قریب ہو کر کہا۔

”تم جوڑن سے یہ بھی کہنا کہ وہ فلمی ستاروں کو شادی میں ضرور بلائے خاص کر بریڈیٹ کو۔“

سادھنا واپس آکر بیٹھ چکی تھی اور اس آخری بات پر پھر ہر جانے کو تھی۔

آریان دن بہ دن صحت یاب ہو رہا تھا سادھنا تو چڑیا کی چوں چوں پر بھی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تھی۔

این اون البتہ جوڑن کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

”کیا آپ چاہتی ہیں میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔“

جوڑن نے بانسری سی میٹھی لے میں بہت مذہب انداز سے این اون سے پوچھا۔ این اون نے گھبرا کر مٹل میں سر ہلایا۔

”برائے مہربانی اپنی نظریں مجھ پر سے اٹھالیں یا خود کو۔ شکریہ۔“

آخری سفر ہے اور اگلا سفر آخرت کی طرف ہو گا۔
”ہاں۔۔۔ ضروری ہے۔“ ویرا نے اور تیزی سے سائیکل چلائی۔

آکسفورڈ روڈ پر اس کی سائیکل رکی تو وہ حیران رہ گئی وہاں کم سے کم پندرہ اسٹوڈنٹس اور موجود تھے ویرا نے ہنڈی کی طرف اشارہ کیا کہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔
”مجھے تھیک سے شوٹ کرنا۔“

”کیا کرنے جا رہی ہو تم۔!“ امرجہ کا خیال تھا روڈ پر وہ سب دوڑ لگا میں گئے۔

”دیکھ لینا۔“ ویرا نے ہاتھوں کو گرزا۔
خود کو گرم کرنے کے لیے پہلے ان سب نے دوڑ لگائی پھر اولڈ کیمرس کی محراب کے اندر ہو گئے تاکہ روڈ پر لگے کیمرے انہیں شوٹ نہ کر سکیں۔

”ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہیں پولیس آنے کی صورت میں کوئی کسی کا زمہ دار نہیں ہو گا۔“ ایک لڑکے نے جس نے اونچی اٹھان والی ٹوپی پہن رکھی تھی ہاتھ میں پکڑی دھاتی پلیٹ کو جھج سے بجا کر کہا۔

امرجہ نے پولیس کے نام پر خوف سے ویرا کو دیکھا۔
”ویرا یہاں کیا ہونے جا رہا ہے۔“

”تمہارا خون۔۔۔ پھر ہم تمہیں یہاں دفن کر دیں گے۔“ ویرا نے سفاکی سے کہا۔

”ٹن ٹن ٹن“ دھاتی پلیٹ پر جھج بجا ان بے چاروں کے پاس صرف دس منٹ تھے نا۔

زبان کے نیچے دو انگلیاں دے کر سٹی بجائی اور محراب کے سامنے پوزیشن لیے کھڑے کمانڈوز یونیورسٹی آرک پر ٹوٹ پڑے۔ اسے سر کرنے کے لیے۔

امرجہ کو نہیں معلوم تھا کہ یونی کو سر کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ اسے گمان سا ہوا کہ ذرا دور ایک کیمرہ چھپا ہوا ہے جس کے پیچھے جیمز کیمرن کھڑا اپنی نئی آنے والی فلم کے لیے ریکارڈنگ کر رہا ہے۔

امرجہ نے سر کو جھٹکا سیارہ ”کیا وہ پاگل خانے سے بھاگے گا لوں کے درمیان تھی۔؟“

ابن اولن خاموشی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ یعنی اس نے جو روڈن کے لب تو جلتے دیکھے تھے بر آواز اس کے کانوں کے پردوں سے اندر نہیں اتر سکتی تھی۔ سادھنا کو منہ پر ہاتھ رکھ کر پھر سے باہر جانا پڑا۔

اور یوں بہار کی دلہن شارلٹ اور بہار کا گڈا جو روڈن بابا امرجہ سے شادی کی اجازت لے گئے۔

رات بھر شارلٹ کی چمکتی ہوئی آنکھیں امرجہ کی آنکھوں میں اندھیرا کرتی رہیں۔ شارلٹ کا بھی کوئی خاندان نہیں تھا اس کی ذات پر ایک نہیں کئی سوالیہ نشان تھے، لیکن جو روڈن اسے بیاہ کر لے جا رہا تھا۔ شارلٹ نے بتایا تھا کہ جو روڈن کا خاندان کافی بڑا ہے اور وہ شارلٹ کو لے کر بالکل خوش نہیں ہیں اور انہوں نے صاف صاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا ہے، لیکن جو روڈن نے ان کی ناپسندیدگی کی پروا نہیں کی اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

تو یہ ہوتی ہے محبت۔۔۔ بنا کسی سوال و جواب کے۔۔۔ ٹھیک ہے ”محبت“ کا اندھا ہونا ضروری نہیں لیکن ”محبت“ کا ہی اتنا بیٹا ہونا بھی ٹھیک نہیں۔ کہ پہلے سوال نامے کو بھرو پھر آگے بڑھو، جمع تفریق کرو حاصل جمع نکالو پھر اقرار، انکار کرو۔ اور یہ بھول جاؤ کہ محبت ہی تو سب سے پہلے ذات و نسل کا فرق مٹاتی ہے۔۔۔ عرش و فرش کا۔۔۔ تخت و خاک کا۔۔۔ کم و زیادہ کا محبت ہی تو سب برابر کر دیتی ہے۔ جڑ سے کل ہوتی ہے اور کل ہی رہ جاتی ہے اگر ایسا نہ کرے تو وہ محبت نہیں رہتی۔

سوال و جواب نکالتے وہ رات گزر گئی۔
اگلی رات ویرا اسے سائیکل پر بٹھا کر لے گئی وہ اسے آکسفورڈ روڈ کی طرف لیے جا رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”یونی۔“ ویرا کھڑی ہو کر سائیکل چلا رہی تھی۔
”اس وقت۔۔۔ آدھی رات کو۔۔۔؟“ امرجہ مضبوطی سے سائیکل کو تھامے رہی۔

وہ بس گر جانے کو ہی تھی اتنی بار ویرا کی رو لڑ کو سٹر پر بیٹھ جانے کے باوجود ہر بار اسے یہی لگتا کہ یہ اس کا

چڑھائی اوپر سے پانی بھرے غبارے۔ آسمان کام نہیں کرتے تھے وہ۔
ایک ایک کر کے چار کے غبارے پھٹے وہ نیچے کو دو گئے۔۔۔ رہ گئے کارل اور ویرا، اب کارل کو ہارنا موت لگ رہا تھا اور ویرا کو ہارنا لینا۔

ویرا ایک سرخ سے کارل مخالف سرخ سے محراب کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے موت و زندگی کی جنگ تھی دونوں کم و بیش ایک ہی وقت میں اس سفید جھنڈے پر جھپٹے جو انہوں نے پہلے سے ہی وہاں لگا دیا تھا۔ جھنڈا ویرا اور کارل دونوں کے ہاتھ میں بیک وقت آیا تھا۔ کارل نے زور سے جھٹکا دیا ویرا اگر تے گرتے پچی ویرا نے اس سے زیادہ زوردار جھٹکا دیا لیکن کارل ہلا تک نہیں اور دانت نکالنے لگا ویرا نے غبارے پر پھوڑ دیا جبکہ کارل نے اپنا غبارہ امرجہ کے سر پر پھوڑنا چاہا لیکن امرجہ پیچھے ہٹ گئی۔

خیالی جیمز کیمرن نے تالی بجائی اور انگوٹھے کا اشارہ دے کر کیمرہ کلوز کر دیا۔

دونوں میں سے اصل و زکون ہے اور کس کے ہاتھ میں پہلے جھنڈا آیا اس کے لیے جو دوسرے کھلاڑی کھڑے دیکھ رہے تھے ان سے دو ٹوک کروائی گئی جس کے رزلٹ میں دس ووٹ لے کر کارل جیت گیا۔

”یہ سب تمہارے چچے ہیں اس لیے فیصلہ کارل کے حق میں کیا ہے۔“ ویرا بھڑک اٹھی وہ کارل کو سمجھتی ہی کیا تھی، نت نئی شرارتوں کا چوبہ دان، چوہا ہی۔

”چلو میرے دوست اس قابل تو ہیں کہ ایسے کار آمد چچے بن سکیں، تمہاری زنگ آلود چچی تو اس قابل بھی نہیں ہے۔“ سیڑھی لگا کر بھی دی تا تو یہ دو فٹ اوپر چڑھنے سے پہلے ہی چچہ کی سرسارے مانچسٹروں کا اٹھا دے گی۔ مس رشیا! اتنی چچی بدلو۔“ کارل نے انگلی سے امرجہ کی طرف اشارہ کر کے منہ اٹھا کر ہنستا شروع کر دیا، سب ہی ہنسنے لگے۔

امرجہ کا خون کھول اٹھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا جی چاہا کہ کارل کا منہ یوں توڑ ڈالے کہ اسے بیس نہیں

نہیں، وہ مانچسٹروں پر نشی کے ان اسٹوڈنٹس کے کرتب دیکھ رہی تھی جنہوں نے خفیہ سوسائٹی بنا رکھی تھی جن میں شامل اسٹوڈنٹس، ایکس مین، اسپانڈر مین، اور جیمز بننے کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے، یعنی وہ الوادہ درست تھی کہ چند اسٹوڈنٹس نے کئی سو فٹ اونچی آسمان سے کی دو عمارتوں کی چوٹیوں پر رسہ تان کر ان پر چمٹ قدمی کی۔ وہ چمٹ قدمی کرنے والے کون ہوں گے ان ہی میں سے کوئی نا۔۔۔ ان چار لڑکیوں اور دس لڑکوں میں سے کوئی۔

ویرا اچھے فٹسی چھپکلی آرک پر یہ جاوہ جا۔ جیسے یہ اس کا خاندانی پیشہ ہو، دیواروں پر ریٹینا، چڑھائیاں چڑھنا۔۔۔ بس سب سر کر لینا اور جیسا کہ امرجہ سوچ رہی تھی کہ وہ اب گرے کہ تب تو ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں گرا تھا، البتہ ان کے وہ غبارے جو انہوں نے منہ میں لے رکھے تھے اور جن میں پانی بھرا تھا وہ پھٹتے گئے اور جس جس کا غبارہ پھٹا گیا وہ ٹھیل سے باہر ہو گیا اور آرک سے نیچے کود گیا۔ جیسے پہاڑ پر درخت پر چڑھائی کی جاتی ہے ایسے ہی وہ اوپر سے اوپر جا رہے تھے اصل کوہ پیماہ اور بن ماس بھی ان کے ساتھ آکر مقابلہ کرتے تو ہار جاتے۔ یہ حقیقت ہے آنکھوں دیکھی، چوہہ میں سے چھ اپنے غباروں سمیت یونی آرک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان چھ نے اپنے پانی بھرے غبارے فضا میں پھوڑ کر اپنی فتح کا اعلان کیا، ان چھ میں کارل اور ویرا بھی شامل تھے۔

وزیر حضرات مسکراتے ہوئے نیچے کود آئے۔
یہ ٹھیل کا پہلا راؤنڈ تھا، ابھی دو سرابائی تھا، اب انہوں نے پہلے سے زیادہ وزن اور بڑے غبارے منہ میں لے لیے، ایک دو تین کا اشارہ کیا گیا سٹی بجائی گئی اور لنگور حضرات، مستقبل کے ایکشن ہیروز، ہیرو سنز پکڑے آرک پر ٹوٹ پڑے۔

ویرا کمانڈو نیچے نے جنگی گوریلے کی سی پھرتی سے کونے میں فٹ باپ کو چھپنا اور امرجہ نے پلکیں بھی نہیں جھپکی تھیں کہ وہ یہ جاوہ جا۔ اوہرا دھڑا ہاتھ پیر پھنسانی ویرا تیزی سے اوپر چڑھ رہی تھی۔ ایک تو

امرحہ بت سی بن گئی۔۔۔ اب نہ پوچھ سکی ”کیا واقعی؟“

ویرانے اس کی بارہ بجے والی شکل دیکھی امرحہ نے اس کی ”میں تمہیں کھا جاؤں گی۔“ والی شکل پر غور کیا اور دونوں کے جڑوں سے یکدم پھر پھر قہقہوں کے کبوتر نکلتے۔

”یہ تم دونوں میں کیا کچھڑی پک رہی ہے آج کل؟“ مہجناشتے کی میزبر لیڈی مہر پوچھ رہی تھیں۔

امرحہ نے ٹال میں صرف سر ہلایا جبکہ ویرانے منہ پھلایا لیڈی مہر نے این اون کی طرف دیکھا این اون آج کل لیڈی مہر کی کارندہ خاص بنی ہوئی تھی اور اس کارندہ خاص نے چابی کی گڑیا کی طرح سب سنا دیا۔

سب۔

لیڈی مہر کتنی ہی دیر ویرا کو دیکھتی رہیں۔

”یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تم میں بہت کچھ خاص ہے۔“

لیکن اتنا زیادہ خاص ہے مجھے اندازہ نہیں تھا اور امرحہ

تم۔ تمہیں یہاں آکر پر لگے ہیں یا تم پرانے سلمان

میں چھپا کر لائی تھیں جو تم نے یہاں آکر لگا لیے۔“

دونوں بھی کھی کھی کر کے لگیں۔

”زمین پر کھو مو پھو جوجی میں آئے کرو۔ کبھی قانون

نہ تو تو۔ دنیا میں ایسا کوئی شوق نہیں جسے اصولوں کو

توڑ کر ہی پورا کیا جاسکتا ہو۔ حدوں سے باہر ہر حال

نہیں نکالنا چاہیے خاص کر ایک طالب علم کو۔“

ویرانے گھور کر امرحہ اور این اون کو دیکھا ہر طرف

سے اس کی ہمدردی پر لعن طعن کی جارہی تھی۔

”مجھ سے بچ جانا اب تم“ ویرانے جلیانی میں این

اون کو دھمکی دی۔

”یہ مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے رہی ہے

آئی! این اون نے فوراً ہی ایک کی تین لگا کر تادی

امرحہ کا منہ کھل گیا یعنی این اون بھی پر سلمان میں

رکھ کر ساتھ لائی تھی یا مہجناشتے پونی کے بلوغ سے توڑے

تھے آخری خیال پر اتفاق کیا جاتا ہے۔

پونی میں کارل آیا اسے دیکھ کر چلا گیا پھر اگلے دن وہ

بس سے اتری ہی تھی کہ وہ اس کے پاس آیا اور ہاتھ

ڈون گیا تھا اور آفیشل وارننگ لیٹر بھی تفصیلات اور

ویڈیو کے ساتھ۔ کوئی کم بات تھی۔ وہ ٹام کروڈینی

اپنے ہنر دکھاتی رہی اور انتظامیہ نے اس کی بے عزتی

کردی۔ اصل بے عزتی اس کے فائور نے اس کی کی

انہوں نے کہا وہ سو بار ایسی عمارتیں پھلانگے لیکن

قانون کو ہاتھ میں نہ لے۔

”تم نے روس کی ٹاک کٹوا دی۔ تم نے کیا کیا؟“ وہ

بار بار یہی کہتے جاتے ”پورے مہجناشتے میں تمہیں

یونیورسٹی کی آرک ہی ملی تھی سر کرنے کے لیے۔“

اس پاس دیکھنا تھا کوئی ایک آدھ ہاڑل ہی جاتا۔“

وہ اتنی زور زور سے چلا رہے تھے کہ آواز ویرا کے بند

کمرے سے باہر تک آرہی تھی امرحہ اور سادھنام

سارھے سنتی رہیں دیر اسوں سوں کرتی رہی۔

”تو ویرا بھی روئی ہے۔“ امرحہ کو نجانے کیوں

حیرت سی ہوئی۔

”مجھے معاف کر دو ویرا!“ بند دروازے کے پاس

اس کی سوں سوں سننے کے بعد امرحہ نے ہمت کی اندر

جانے کی۔

”تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟“ ویرا نے سنجیدگی سے

پوچھا۔

”اگر ہم کسی کو اپنی محبت کا یقین نہ دلا سکیں تو اس کا

مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔“

”میں نے اپنی اور تمہاری گفتگو کارل کو سنائی تم

نے اس کا بدلہ لیا؟“

”خدا آگواہ ہے کہ نہیں۔ مجھے صرف کارل کو سبق

سکھانا تھا امرحہ نے بڑا دل لگا کر شدت سے بچ بولا ویرا

کئی لحظے اسے دیکھتی رہی۔

”تم بہت معصوم ہو امرحہ! بہت زیادہ۔“ ویرا نے

مسکرا کر کہا۔

امرحہ کے دانت نکل آئے ”کیا واقعی؟“

”ہاں اور تم بے وقوفوں کی ملکہ معظّمہ بھی ہو تم

کی کو بھی لے ڈوب سکتی ہو کسی کا بھی سر قلم کروا

سکتی ہو۔“ ویرا نے چلا کر دونوں لے لے بازوں کو ہوا

میں لہرا کر کہا۔

بچنے لگتا۔

ویڈیو بھیج دی گئی۔ کتابوں اور جوتوں والا حسب

برابر ہو گیا۔ امرحہ رات کو سکون سے سوئی۔ اتنے

سکون سے۔ اتنے سکون سے کہ ایک گھنٹے کے اندر

اندر ہی وہ خوفناک چیخ مار کراٹھ بیٹھی۔ کارل اس کے

بستر پر سانپوں سے بھرا یا کس انڈیل رہا تھا۔

”اف۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔“ امرحہ نے اپنا

پسینہ صاف کیا۔

کاش ڈین کا آئی ڈی ہیک ہو جائے یا ڈین ہی۔

ڈین ہی۔

امرحہ نے سونے کی کوشش کی اور اگلی بار گلا

گھونے جانے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور گمرے گمرے

سانس لینے لگی۔

اب وہ کیسے مرنا پسند کرے گی۔ اس کا فیصلہ کسی

اور کو کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کون۔ جی ہوی۔

کارل کو انتظامیہ نے حاضر کر لیا۔ دو گھنٹے تک

میٹنگ ہوتی رہی اگلی میٹنگ میں ویرا کو بھی شامل کیا

گیا۔ کارل ڈوب رہا تھا تو ویرا کو بھی لے کر کیوں نہ

ڈوبتا باقی کے کھلاڑیوں کو البتہ اس نے بجا لیا تھا۔ کارل

نے اپنے دوست کی بتائی ویڈیو انتظامیہ کے آگے حاضر

کردی۔

فیصلہ تین دن کے لیے یونیورسٹی سے باہر۔ نو لیکچر

نو کلاس۔ ساتھ وارننگ وارننگ مطلب عام

وارننگ نہیں مطلب اگلی بار کسی بھی قسم کی شکایت

پر سیدھا یونیورسٹی سے باہر۔

یونیورسٹی انتظامیہ ان معاملات میں کافی سخت ہوتی

ہے لیکن ہر بار وہ اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ

ان کے فیصلے سے یونیورسٹی کی ساکھ متاثر نہ ہو۔ اگر

ایسے ہی اسٹوڈنٹس باہر نکالے جاتے رہے تو انگلیاں

یونیورسٹی پر ہی اٹھیں گی۔

ویرانے امرحہ سے بات چیت ہی بند کر دی ”امرحہ

نے اسے منانا چاہا لیکن ناکام رہی ویرا کے گھر ڈین کا

سینڈز کے اندر آرک کی چوٹی کو ہاتھ لگا کر دکھادے اور

غبارے کو پتھروں سے بھر کر اس کے سر پر پھوڑے۔

آہ۔ پر ایسے سننے ہی دیکھے جاسکتے تھے۔ تصویر

ٹائٹل کے لیے اگر وہ اسٹول پر گھڑی ہو جاتی تو دادا سے

اسٹول پکڑواتی کہ مل کر اسٹول اسے گرا ہی نہ دے۔

اب جو تین فٹ کے اسٹول پر ایسے کھڑا ہو گا اس پر

ایسے جسکی چن طرز کے سننے دیکھنا بنتا تو نہیں ایک

زور دار سینی گوجی اور خفیہ سوسائٹی کے ارکان میں

بھلبلی مچی جلدی سے وہ ایک سائیکل پر دو دو تین تین

بیٹھے اور یہ جاہ جا۔

سینی رات کو گشت کرنے والی یونیورسٹی پولیس کی

آمد کا اعلان دینے کے لیے خفیہ سوسائٹی کے ہی ایک

رکن نے بجائی تھی جو اسی کام پر مامور تھا۔ امرحہ بھی

پولیس آگئی۔

”ہائے میری پونی گئی امرحہ گھبرا کر چلائی ویرانے

اسے کھینچ کر سائیکل پر بٹھالیا۔

”اب ہمیں پونی سے نکال دیا جائے گا۔“ امرحہ

نے دانت پر دانت جمائے۔

ویرانے قہقہہ لگایا ”میں پورا برطانیہ ہلا ڈالوں گی اگر

کسی نے ایسا کرنا چاہا۔“

”تم تو ہلا ڈالو گی میں کیا ہلاؤں گی۔ میری تو داوی

نے اس بار میری پیشانی پر لکھوا دینا ہے ”منحوس ماری

جہاں جاتی ہے۔“ ویرا غرق گرا آتی ہے۔

ویرا کا قہقہہ بڑا عظیم تھا۔ امرحہ کے ذہن میں

آنے والا خیال اس سے بھی زیادہ عظیم تھا۔ اور اس

خیال کو اس نے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔

ہینڈی ریم سے بنی ویڈیو اس نے محترم ڈین اور

انتظامیہ کو میل کر دی۔ ڈیرک سے سیکھی ایڈیٹنگ

سے اس نے ویرا کو کٹ کر نکال دیا اور صرف کارل کو

رہنے دیا۔ اس کا دل چاہا کہ The Tab میں بھی

بھیج دے لیکن ویب پر اس ویڈیو کے پوسٹ ہوتے ہی

کارل یونیورسٹی میں اور زیادہ مشہور ہو جاتا کیونکہ

سارے اسٹوڈنٹس ایسی حرکتوں کو بہر حال بہت پسند

کرتے ہیں اور اس طرح کارل کے نام کا ڈنکا پونی میں

سینے پر باندھ لیے۔ امرجہ نے بس کی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے یونی کی دیوار کے ساتھ کمر نکائے آتی جاتی بسوں کی طرف دیکھ رہا تھا یعنی مس امرجہ بیگ لیڈی آف پاکستان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ امرجہ نے ساتھ بیٹھے اسٹوڈنٹ سے پانی کی بوتل لے کر دو گھونٹ پانی پیا۔ بس ایسے ہی گلا خشک سا ہو رہا تھا اس کا جی تو چاہا کہ اگلے اسٹاپ اتر جائے پر وہ ڈرتی ورتی تھوڑی گھی کامل سے۔ کیا سمجھتا ہے کامل اسے۔

سینے پر ہاتھ باندھے ہڈی کے سر کو ڈھانپنے وہ اسے جم تے انداز سے گھورنے لگا۔ اب وہ نہ بول رہا تھا نہ اس کا راستہ چھوڑ رہا تھا وہ کتنی بھی تیزی سے دائیں بائیں سے ہو کر نکل جانا چاہتی اتنی ہی پھرتی سے وہ اس کے آگے آ جاتا۔

”میرا راستہ چھوڑو۔“ امرجہ نے چلا کر کہنا چاہا لیکن آواز نکلی ہی نہیں۔ پانی۔ پانی۔ پانی کہاں ہے۔؟

”تم۔“

”اب تک تم مجھے پنچ (Punch) مارتے رہے ایک میں نے مار دیا۔“

”مجھے تمہارا پنچ اچھا لگا۔ ہمیں اب دوستی کر لینی چاہیے۔“

”نہیں لنگوروں سے دوستی نہیں کرتی۔“

”پر مجھے مینڈکیاں پسند ہیں۔ امرجہ۔“

”The Disaster Queen“

”کامل دی فٹور۔“ آکسفورڈ روڈ پر دونوں آنے سے سامنے کھڑے لڑ رہے تھے۔

”فٹور؟“ ہڈی کے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اتارا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

”ہاں فٹور۔ کرتے رہو اب اسے گول۔“

”ضرورت نہیں۔ مجھے یہ نام پسند آیا ہے۔“

”تم پر پنچ بھی بہت رہا ہے بلکہ اسے اپنے نام رجسٹر کروالو۔“

”Hmm۔ پھرتے ہیں امرجہ۔“

اس کے کراس بیگ کی اوپری جیب سے جھانک کر ایک عدد چاکلیٹ کو نکال کر وہ چلا گیا ساتھ ہینٹ ڈس گیا۔ بھاڑ میں جائیں اس کے ہینٹ۔ امرجہ یونی آگلی اور سارا دن اس حد تک محتاط رہی کہ کلاس میں ہلوی الرحلین نے پین مانگا تو وہ شک سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں چاہیے تمہیں مجھ سے پین؟“

”میرا پین کام نہیں کر رہا۔“ وہ بے چارہ مصری گھبرا گیا۔

”تم کسی اور سے لے لو۔ مجھ سے ہی کیوں مانگ رہے ہو؟“

”تم میری ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہونا اور اتفاق سے مجھے یہ غلط فہمی رہی تھی کہ تم کافی خوش اخلاق ہو۔“

پین نامی چیز عاریتاً مانگ لینے پر ایسے خوشنود نہیں ہو جاتی ہوگی۔“

”میرے پاس کوئی پین نہیں ہے۔“ تین پین اس کے بیگ میں رکھے تھے۔

پامیلا نے اس سے کہا۔ ”تھوڑی دیر کے لیے میری بکس اور لیپ ٹاپ کو سنبھال سکتی ہو مجھے کمپیوٹر ڈی پارٹمنٹ تک جانا ہے، صرف پندرہ منٹ کے لیے۔“

”میں خود بھی وہیں جا رہی ہوں۔“ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی، نہیں وہ سائی کے پاس جا رہی تھی۔

پورا دن وہ نفسیاتی مریض بنی رہی۔

چند دن گزرے تو وہ اس واقعے کو بھولنے لگی اسے اور بھی بہت کام تھے جیسے کہ پاکستانی اسٹوڈنٹ سوسائٹی کے ساتھ مل کر امرجہ سوشل ورک کر رہی تھی۔

مقامی ہسپتال کے لیے انہیں فنڈز اکٹھے کرنے تھے، بچوں کے سرے اور اندھے پن کے علاج کے لیے۔

امرجہ شہزادے اچھے خاصے پونڈز نکلوانے میں کامیاب ہو چکی تھی ساتھ ہی شہزادے اسے اپنے پرانے ”اور“ بے کار ”بیگ“ جو تے اور کوٹھے سے تھے جو امرجہ نے اپنے اور آرٹ ڈی پارٹمنٹ کی لڑکیوں کو اچھے داموں میں بیچ دیے۔ وہ عالیان کے پاس بھگدائی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ پھر سے چھپ کر اسے دیکھ

رہی تھی اور وہ ایک دم سے اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”میں فنڈز جمع کر رہی ہوں۔“ وہ گھبرا گئی باکس آگے کیا۔ ثبوت!

اس نے چند پونڈ فنڈ باکس میں ڈال دیے اور جانے لگا۔

”بچوں کے اندھے اور سرے پن کا علاج ہونا ہے۔ علاج منہنگا ہوتا ہے، ہمیں زیادہ پونڈز چاہئیں۔“ اس کی پشت سے گھوم کر وہ جلدی سے آگے آئی اس کا راستہ روک لیا۔ اسے زیادہ پونڈز نہیں اس کا زیادہ دنت چاہیے تھا۔

اس نے اپنے کراس بیگ میں سے ساری کتابیں نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں اور بیگ کے ہینڈلے میں بڑے ہوئے سکوں کو اکٹھا کیا اور فنڈز باکس میں ڈال دیے۔ اور پھر سے جانے لگا۔

”کتنے شرم کی بات ہے عالیان۔! تم نے کتنا کم فنڈ دیا ہے۔“

”میرے پاس جتنے تھے میں نے سب اس باکس میں ڈال دیے ہیں۔“ وہ بے زاری سے بولا۔

”یہ تو بہت بری بات ہے، بلکہ قریب قریب بے عزتی کی۔“ اس نے کہتے اپنے بیگ میں سے جلدی سے دس پونڈ نکالے اور باکس میں ڈال دیے۔

”یہ دس پونڈ کی ٹوئیٹ میں نے تمہاری طرف سے باکس میں ڈال دی ہے، اب تم مجھے دس پونڈ واپس کر دینا۔“ ٹھیک ہے کر دینا یاد ہے۔“ امرجہ کو اپنی بہادری پر حیرت ہوئی۔

عالیان خاموش اسے دیکھ رہا تھا۔

”جب چاہے کرونا میں جلدی نہیں مچاؤں گی۔“

امرجہ کہہ کر پلٹ آئی، جیسے وہ اسے دیکھ رہا تھا اس پر تو امرجہ نے یونی کے بیچ بیٹھ کر دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس بار کوئی اس کے سامنے گھٹنوں کے بل آکر نہیں بیٹھے گا، وہ یہ بھی جانتی تھی۔ اس بار مغرب و مشرق کا تل میل نہ ہوگا اس بار اسے چپ نہ کروایا جائے گا۔ نہ جان۔ نہ پہچان پونہر کسی میں کوئی امرجہ نہیں۔ اسی یونیورسٹی میں کوئی عالیان بھی

نہیں۔

کارل فوراً اس کے پاس آیا اور صرف دو پونڈ باکس میں ڈالے ”یہ لو“ آج سے ہم دوست ہیں۔“ چمک دار دانتوں کی نمائش کی۔ خواہ مخواہ۔

امرجہ نے فنڈ باکس کو کھول کر دو پونڈ نکالے اس میں اپنے بیگ سے دو پونڈ نکال کر شامل کیے اور اسے واپس کیے۔

”یہ لو دوبارہ ایسی بات نہ کرنا۔“ اس کی آخری دھمکی کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض بن گئی تھی۔ اب یہ دوستی کی فرمائش بھی اسی کی کڑی ہوگی۔

کارل نے اپنی آنکھیں چندھیالیں، اس کے پاس اس شہہ کی مات فی الحال نہیں تھی، وہ زیر لب مسکرایا۔ جب وہ ایسے مسکراتا تھا تو مطلب اس کا یہ ہوتا کہ مجھے اچھا لگا۔ بہت اچھا لگا۔ میں نے انجوائے کیا، ویسے وہ یونی کا ایک ایک لمحہ ہی انجوائے کر رہا تھا۔

وہ ہر کھیل کا بادشاہ تھا۔ اس کے سر پر فتح کا تاج بجا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ اسٹوڈنٹ یونین کے صدر سے زیادہ مقبول تھا اور ظاہر ہے اپنی حرکتوں کی وجہ سے تھا۔ اب یونی میں موجود کمپیوٹر کو ایک اسٹوڈنٹ استعمال کر کے اٹھتا ہے تو فوراً اس پر کارل بیٹھ جاتا ہے اپنے موبائل کو اس کمپیوٹر سے جوڑ کر ننھا منسا سا لیکن خطرناک ہیکنگ سوفٹ ویئر عارضی طور پر انسٹال کرتا ہے اس کمپیوٹر پر استعمال ہوئے تازہ تازہ آئی ڈی کے پاس ورڈز کو توڑتا ہے اور بس۔

نہیں وہ بلیک میل نہیں کرتا۔ ہرگز نہیں وہ آئی ڈی اور پاس ورڈ کا غلط استعمال بھی نہیں کرتا، بس وہ تھوڑا بہت ڈیٹا، کچھ تصویروں، کچھ پیغامات، کچھ چیٹ موبائل میں محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اسے دی پرنت ورک کے کسی مہنگے ریسٹورنٹ میں لچ ڈنر کروا دیا جاتا ہے، سینما کی ٹکٹ لے دی جاتی ہے، کھانے پینے کی دوسری اشیا اس کی وارڈ روب میں بھر دی جاتی ہیں اور اسی وارڈ روب میں چند اور نئی شہر آ جاتی ہیں، نئے شووز بھی اور اسے اپنی نئی کار استعمال کے لیے دی

جانتیں جنہیں وہ دنوں واپس نہ کرتا جب تک
ماچھڑی ایک ایک سڑک کی سیر نہ کر لیتا۔ بس یہی
سب چھوٹا بڑا۔ وہ بھی سب اپنی خوشی سے کرتے ہیں
وہ مجبور نہیں کرتا۔

اسٹوڈنٹس کے گھروں میں Prank کا لڑ کرنا بھی
اس کا مشغلہ ہے، لیکن اس مشغلے کا استعمال وہ اس
وقت کرتا جب وہ انسانوں سے بور ہو چکا ہوتا۔ وہ
اسٹوڈنٹس کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے مختلف
کہانیاں گھڑ کر ان کے گھروالوں کو سنا تا اور اگلے دن وہ
بے چارے ہال میں بھاگے آتے کہ آخر سلویا کیوں خود
کشی کرنے جا رہی تھی۔ صرف سامنے کے دو دانت
نوٹ جانے پر خود کشی۔؟

اور شیلے راتوں کو اٹھ کر الو کی آوازیں کیوں
نکالتا ہے وہ بھی کھڑکی سے آواہاڑتا ہر نکال کر کیا وہ
الو کی طرح اڑنے کی کوشش بھی کرتا ہے؟ اوہ کوش۔۔۔
اور یہ کرسٹی کو بلیوں سے اتنی الرجک کیوں ہونے
لگی ہے کہ اس نے تین بلیوں کا قتل کر دیا اور انہیں
اپنے بیڈ کے نیچے دفن کر دیا اور جس دن اسے قتل کرنے
کے لیے کوئی بلی نہیں ملتی وہ بلی کی صورت والی اپنی ہال
میبٹ لڑکیوں پر حملہ کر رہی ہے۔ Dhuzz۔۔۔
Dhuzz کرسٹی کا تلبے بنے جا رہی ہے۔

اور روہنی وہ کیا کرنا چاہتا ہے آخر وہ اپنے کیمسٹری
کے پروفیسر کو دیکھتے ہی پانگلوں کی طرح کیوں چلانے لگتا
ہے اور ہال کی آخری منزل کی چھت پر آدھی رات کو
چڑھ کر وہ کسے آوازیں دیتا ہے۔ کیا کیا اس کا کہنا ہے
کہ مارلن منو اس سے ملنے آتی ہے۔ آہ میرا روہنی۔۔۔
وہ تو بہت لائق تھا۔ ہال میں والدین اپنے پانگل دیوانے
بیمار ذہن بچوں سے مل جاتے اور نیچے سوچ سوچ کر
پانگل ہو جاتے کہ آخر یہ کون ہے جو ان کے گھر راتوں کو
فون کرتا ہے اور والدین یہ سوچتے کہ بچے ان سے کچھ
نہ کچھ تو چھپا رہے ہیں۔ لیکن کیوں اس کی کیا وجہ
ہے۔؟

وجہ کارل تھی اور کافی بڑی وجہ تھی۔
امرحہ کافی آگے جا چکی تھی کارل سے مکالمہ میں

اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کارل بھاگ کر اس کے
سامنے آیا۔

”ٹھیک ہے نہیں کرتا دوستی کی بات۔ ویسے میں
بہت اچھا انسان ہوں۔“

”مجھے تم جیسے انسانوں سے دور رہنا چاہیے۔“
”میں پاکستان کو بہت پسند کرتا ہوں، کاش وہ میرا
ملک ہوتا، خاص کر لاہور پر تو میں فدا ہوں۔“ اس نے
دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”مجھے تشویش ہو رہی ہے، پاکستان کی قسمت کو
لے کر خاص کر لاہور کو لے کر۔“

”میں بزنس ٹائیکون بن جاؤں گا تو پاکستان کو کافی
بزنس دوں گا۔“

”اف اتنے برے حالات کبھی نہیں آئیں گے
میرے ملک پر۔“

”کیونکہ جتنے برے آنے تھے وہ تو تمہاری پیدائش
سے آچکے ہوں گے۔“ پوری جان سے قہقہہ لگاتا
چلا گیا۔

امرحہ تو سناٹے میں ہی آگئی، اسے بہت بری لگی
اس کی آخری بات، حقیقت میں اب تک کی جانے
والی ساری باتوں اور حرکتوں میں سب سے زیادہ بری
بات وہ کون تھا اس کے ماضی کے بارے میں ایسی
خطرناک بات کرنے والا۔

جس طرح کا کارل تھا اور جو بات وہ کر گیا تھا امرحہ کو
یقین سا ہو گیا کہ وہ اس کی پیدائش تاریخ جان چکا ہے
ہاں ایسا ہو گیا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح سے اس کا ماضی
بھی جان چکا ہے، اب وہ یونی میں ان باتوں کا اشتہار لگانا
پھرے گا۔



وہ جان گیا کہ ڈین کو ویڈیو بھیجنے کا معرکہ مارنے والی
پاکستان میں کس حیثیت کی مالک رہی ہے۔ امرحہ نے
اپنا فون اپنا بیگ چیک کیا کہ ضرور اس نے ان میں کوئی
چپ (chip) لگا دی ہوگی یا ویرا سے لگوا دی ہوگی بعد
میں ویرا جینفرو لارنس طرز کی صورت پر بمشکل

مصنویت طاری کر کے کہہ دے گی۔
”مجھے کیا پتا تھا وہ تمہاری نحوست کے بارے میں
جان جائے گا۔“

وہ اور دادا اکثر ماضی کے بارے میں بات کرتے
رہتے تھے۔ وہ اپنے فون کو ایم ایس سی کرنے والے
بارک کے پاس لے گئی اس سے اس کی اچھی ہائے بیلو
تھی۔

”بارک! اسے چیک کر دو اس میں کوئی ایسا سسٹم تو
لکھی نہیں جس سے کوئی اور میری باتیں سن سکے۔“
”تم مذاق کر رہی ہو؟“ فون اس نے ہاتھ میں لے
لیا اور سیدھا ان باکس میں پہنچا، کیونکہ یہ ایک
یونیورسل عادت بن چکی ہے۔ فون کسی کا بھی ہو جانا
سیدھا ان باکس میں ہوتا ہے۔

”میرے پیغامات پڑھنے بند کرو۔ میں سنجیدہ
ہوں۔ اس میں کوئی ایسی چپ لگی ہے تاکہ کوئی میری
ساری گفتگو سنتا رہے۔“

بارک سنجیدگی سے فون چیک کرنے لگا پھر سر اٹھا کر
اسے دیکھا۔

”ہاں! تمہارا شک ٹھیک ہے، اس میں ایک سسٹم
لکھی ہے۔“

”اوہ! امرحہ کا گلابی سفید رنگ سیاہ پڑ گیا۔
”تم اس مین کو دیاؤ گی تو ساری یونیورسٹی دھماکے
سے اڑ جائے گی اور اس مین کو دیاؤ گی تو پورا ماچھڑی غائب
ہو جائے گا۔ اور اس تیسرے مین کو دیاؤ گے تم خود
غائب ہو جاؤ گی، تم لوگوں کو نظر آتا بند ہو جاؤ گی۔ میرا
خیال ہے تم اس تیسرے مین کا استعمال کرو۔“

فون اس کے آگے کر کے وہ اسے ایک ایک مین
کے بارے میں سنجیدگی سے جاننے لگا۔ بے حد
سنجیدگی سے۔ پھر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

”کیا تمہارے پیچھے اسکاٹ لینڈ کی پولیس لگی ہے
امرحہ؟“ بننے سے فارغ ہو کر اس نے پوچھا۔

سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے اسکاٹ لینڈ یا روکی
پولیس بہتر تھی کارل سے۔ اسے کارل ناپسند تھا جبکہ
وہ تو اتنا پیارا تھا۔ ہرمن مولا سا۔۔۔ سوچتا کرتا اور دیا۔

ہو جاتا۔ آخر کتنے ہیں دنیا میں ایسے لوگ۔؟
جب کبھی وہ دیوار کے ساتھ کمر نکاسے، ایک ٹانگ
کو کھڑا دوسری کو ترچھا دیوار پر جمائے دونوں ہاتھوں کو
جیب میں رکھے کھڑا ہوتا تو اس کی آرتی اتارنے کو دل
چاہتا ایک تو اس لیے کہ وہ اس پاس والوں کو ”مجھے
رگ کرنا پلٹ کر دیکھو۔“ پر مجبور کر دیتا دوسرا اس لیے
کہ ”یہ بھونچال یہاں کھڑا ہے، کاش تاقیامت یہاں
ہی کھڑا رہے، یہیں کھڑے کھڑے اس کا مجسمہ بن
جائے، ارباب یہ حرکت نہ کرے۔“

مائیکل انجیلو اس کا مجسمہ بناتا تو اسے ایک اور
زندگی خدا سے مستعار لینی پڑتی صرف اتنی سی بات
سوچنے کے لیے کہ وہ ایک خوب صورت انسان کا مجسمہ
بنائے یا خوب صورت شیطان کا۔ یا۔ یا۔ یا۔

بس زندگی تمام ہو جاتی اس کی۔
وہ بے حد گورا تھا، گلابی گورا، نیلی آنکھیں، پتلی
ناک، گھنی بھنوس، لمبی گردن اور ذرا سا لمبو تراچہرو۔
قد ویرا سے ذرا کم، عالیان سے ذرا زیادہ۔ کبھی کبھی
موچھیں رکھ لیتا تو ایسے لگتا کسی قدیم سلطنت کا جنگجو
سلطان ہے جو شیروں کو دائیں بائیں بٹھا کر طعام کیا
کرتا تھا۔ اور ان ہی کی طرح دھاڑا کرتا تھا۔

ہاں وہ اتنا خوب صورت ضرور تھا کہ اگر گاؤں کی
میاریں پانی کے گھرے اپنی چکیلی کمر پر نکائے پگڈنڈی
پر چلتے کارل کے پاس سے گزرتیں تو ضرور کہتیں۔
”وے تو کیسا سوہنا اے۔ ج خدا دا خوف کر۔
وے تو ایسا سوہنا کیوں اے۔؟“

کارل مسکرا دیتا ہے اور شانے اچکا دیتا ہے۔ اور
میاریں کے سبھی گھرے۔ ہاہا۔۔۔ Dhuzz۔۔۔
Dhuzz۔۔۔ Dhuzz۔۔۔

رات کو امرحہ سا دھنکے کمرے میں آئی وہ آریان
کے لیے چند تحائف پیک کر رہی تھی۔

”عالیان گھر کیوں نہیں آتا؟“ امرحہ نے پوچھ ہی
لیا۔

”پہلے ویک اینڈ پر آ جانا تھا پھر اس کی ماما نے منع کر
دیا۔“

”منع کیوں کر دیا؟“ مرحہ سادھنا کی مدد کرنے لگی۔
”میں نہیں جانتی، کبھی کبھار رات گئے آجاتا ہے۔“
”کب... میں نے اسے کبھی آتے نہیں دیکھا۔“

”ایک دو بار سے زیادہ نہیں آیا، رات گئے آتا ہے۔ کچھ دیر ٹھہر کر چلا جاتا ہے۔ زیادہ وہ کھڑکی کے راستے آتا پسند کرتا ہے اسی لیے لہڑی ہر کے کمرے کی کھڑکی اندر سے بند نہیں ہوتی اسی مہینے اس کی سالگرہ آنے والی ہے تو وہ آئے گا ایک لے کر۔“
”اسی مہینے۔ اچھا تمہیں پکا معلوم ہے اسی مہینے نا؟“
”ہاں! سادھنا مسکرانے لگی۔

”اچھا۔ یعنی وہ پھر جتنا مناسب لے کر کھڑکی کے راستے آئے گا۔“ مرحہ یکدم خوش سی ہو گئی۔
لیکن اس بار اسے بچا ہوا ایک نہیں ملے گا، چلو کوئی بات نہیں۔ حالات برے ہو چکے تھے تو اچھے بھی ہو ہی جائیں گے۔ آخر کو ایک دن سب ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ امید کے پودے کو پانی دیتے رہنا چاہیے اور اسے اتنا تاور کر دینا چاہیے کہ مایوسی کا جنگل دور دور تک اگنے ہی نہ پائے۔ دیتے بھی سالی کتا ہے۔“
”اختتام پر سب نہ سہی لیکن بہت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”مرحہ کہتی ہے“ اختتام پر سب برا ہو گا تو کچھ اچھا بھی تو ہو گا نا۔ بلکہ ضرور اچھا ہی ہو گا سب۔“
اور میرا یہ کہنا ہے کہ اختتام کو بھول جائیے۔ زندگی ہر بل صرف شروعات کا نام ہے۔ اسے تنہی سے جاری و ساری رکھیں۔

اگلے دن یونی میں وہ کلاس لے کر نکلی ہی تھی کہ داوی نے بہت خاص وقت نکال کر اسے شرف بات چیت سمجھا۔ وہ بھی ان کی پسند کے جوابات دیتی رہی۔

”نہیں نائنے گانے والی جگہ پر نہیں جاتی۔ ہاں کلب نہیں جاتی داوی، حلال گوشت ہی کھاتی ہوں۔“

سہولت سے مل جاتا ہے۔ جی دو لوگ جاتے ہیں مجھے یونیورسٹی چھوڑنے، پھر جاب پر۔ گھر لے کر بھی آتے ہیں اکیلی نہیں جاتی میں داوی بالکل اکیلی نہیں نکلی گھر سے۔“

”تم پاکستان آ رہی ہو۔؟“
”پاکستان!“ اس کا سانس اٹکنے لگا تو اصل بات یہ کرنی تھی۔

”کب ختم ہو رہی ہے تمہاری پڑھائی۔؟“
”کیوں کیا کرتا ہے آپ کو؟“
”تمہاری شادی اور کیا۔؟“

”کیا کہہ رہی ہیں داوی؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔
”شادی۔ شادی!“ داوی اس سے زیادہ چلا۔
”آپ بول کیوں نہیں رہیں داوی! مجھے آپ کی آواز نہیں آ رہی۔“

”بول تو رہی ہوں۔ حماد دیکھو اسے کیا ہوا اس کی تصویر تو نظر آ رہی ہے اسے میری آواز کیوں نہیں جا رہی۔“
”ہماری آواز آ رہی ہے تمہیں۔ میں تمہیں نظر آ رہا ہوں کیا؟“

”داوی بولیں نا۔ کہاں چلی گئیں۔ اچھا میرا لکچر ہے میں جا رہی ہوں۔“
وہ اس کا پ سے لاگ آف ہو گئی اور لفظ شادی شادی اس کے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگا۔
”تمہارا رنگ پیلا پڑ رہا ہے مرحہ۔“ قریب سے گزرتی جیم کا نے رائے نئی کی۔

”In the memory of
katy the cat

یہ وہ بورڈ تھا جو مرحہ کی کلاس فیلو لوہرن کی پشت پر زنجیر میں پرویا جھول رہا تھا۔ رات اس کی ٹی کا انتقال ہو چکا تھا اور آج وہ سوگ منا رہی تھی۔ اس نے کالی شرٹ اور اسکرٹ پہن رکھی تھی اور بال برش نہیں کیے تھے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ رو رو کر اس کی

آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا یہ بھی نظر آ رہا تھا۔ مرحہ اس کے پاس گئی اس کی ٹی کا افسوس کرنے زندگی میں پہلی بار وہ کسی جانور کے مرنے کا افسوس کر رہی تھی اور کافی مشکل سے ہنس روک کر رہی تھی۔

”کیسے مری بے چاری ٹی۔؟“
”ایسے نہ کہو مرحہ! وہ بے چاری ہرگز نہیں تھی بہت بہادر تھی پرنسز تھی۔“
”اور پرنسز کیٹی کیسے مر گئیں لورین۔؟“

غم کی شدت سے لورین پھر بے قابو سی ہو گئی آنکھیں نشو میں چھپالیں اور ایک ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ اس کی موت کے بارے میں نہ پوچھا جائے اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مرحہ آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھتی رہی، ٹی کی یاد میں دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے اب سچ یہ تھا کہ مرحہ کو دور کے عزیزوں کی وفات پر رونا نہیں آیا کرتا تھا اب لورین کا ساتھ دینے کے لیے کیسے رو لیتی اور لورین کی جان پر آخر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی تھی کہ ایک ٹی کے لیے ایسے جان بکان کر رہی تھی، باقی سب سنجیدگی سے اس سے کیٹی پرنسز کا افسوس کر کر کے جاتے رہے ایک مرحہ ہی اس بے چاری لورین کا غم نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

کچھ لوگ لورین جیسے حساس تھے کہ جانور کے لیے آنسو بہا رہے تھے اور کچھ کارل جیسے کہ انسانوں کو ہی آٹھ آٹھ آنسو رلا رہے تھے۔

مرحہ جاب سے واپس آ رہی تھی۔ رات کا وقت تھا وہ بس میں بیٹھی تھی جو تقریباً خالی ہی تھی۔

”ہائے ڈی کو مین!“ کارل کی آواز اس کی نشست کی دوسری طرف کی رو کی نشست سے آئی اس نے ہڈ پسن رکھا تھا اور ہڈ کیپ سے سر کو پیشانی تک چھپا رکھا تھا۔

مرحہ اپنے چہرے پر وہ بے زاری لے آئی جو داوی اسے دیکھ کر لے آیا کرتی تھیں، اب وہ سمجھی داوی کا قصور نہیں تھا نجس لوگوں کو دیکھ کر ایسے ہی منہ بن جایا

کرتے ہیں۔ آج کی رات خوفناک خواب دیکھتے گزرنے والی تھی، رات کے اس وقت اسے جو دیکھ لیا تھا وہ اور عالیاں سائیکل کا استعمال بہت کرتے تھے خدا جانے آج وہ بس میں کیوں سوار تھا۔

”تم مجھے بری طرح سے نظر انداز کر رہی ہو“ آخر کو ہم یونی فیلو ہیں۔ پھر میرے تم پر کتنے احسانات بھی تو ہیں خاص کر وہ، اگر میں ہارٹ راک میں وہ ڈسک نہ چکواتا تو سوچو عالیاں جیسا بور انسان تمہارا سر کھا رہا ہوتا اور تم مجھ جیسے سرفاسٹ، سپر ہیرو سے محروم ہو جاتیں۔“

”کتنی بد قسمت لڑکی ہو گی وہ جس کا وہ ہیرو ہو گا یعنی بیوی بے چاری نے ایسے ہی مذاق میں کوئی بات کہہ دی اور کارل نے اس مذاق کا جواب دینے کے لیے اسے چھت سے الٹا لٹکا دیا یا فرق میں بند کر دیا ورنہ لائڈری مشین میں ٹھونس کر گھما دیا اور نہیں تو غریب کا ایک آدھ کان ہی کاٹ لیا۔“ مرحہ سوچتی رہی اور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

”آج صرف تمہارے لیے میں بس میں سوار ہوا ہوں۔“

مرحہ نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ مرحہ کو خوف سا آیا ”یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔“

”بس کے کرائے میں“ میں اپنے پونڈ ضائع نہیں کرتا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی نشست کے پاس آ گیا۔

”جو دو پونڈ تم نے مجھے دیے تھے ان میں چند پونڈ اور ملا کر میں یہ لے آیا ہوں۔“ اس نے وہ ہاتھ جو ہڈ پاکٹ میں تھا نکالا اور چھن سے ایک ہتھکڑی نکل کر سامنے آئی۔ ہلک جھپکنے کی دیر تھی کارل نے اس کے ہاتھ جو اگلی نشست کی پشت کے گول راڈ پر رکھا تھا میں ہتھکڑی ڈال کر راڈ کے ساتھ لاک کر دیا۔

”یہ۔“ مرحہ رنگ رہ گئی اس نے ہتھکڑی کو جھٹکا دیا۔

”کارل کیسا بد تمیزی ہے یہ؟“

”بد تمیزی نہیں جواب“ میں ادھار نہیں رکھتا“
لڑکیوں کا تو بالکل نہیں۔“ وہ بڑی شان سے مسکرایا
”کیونکہ میں Count Destroyer ہوں نا۔۔۔“

”کارل مذاق بند کرو۔“
”مذاق کل یونی میں کریں گے۔“ کتاواہ اشاپ پر
رکتی بس سے اتر گیا۔

”کارل!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، ہتھکڑی جھٹکنے لگی۔
”کارل رک جاؤ۔ اسے کھول کر جاؤ۔“ وہ چلائی
لیکن کانوں میں ایرفون لگائے تیز انگلش میوزک پر آڑا
ترچھا ہوتے وہ دور ہوتا چلا گیا۔

بس میں سوار چہ افراد اسے دیکھنے لگے۔
”میری بدد کریں۔“ وہ تیز آواز میں چلائی سب کے
سب بیٹھے دیکھ رہے تھے آگے نہیں آ رہے تھے اس
کی آواز پر جیسے چونک گئے اور اس کی طرف آئے۔
”اوہ۔۔۔ یونیورسٹی کے چوزے جو نہ کریں وہی کم
ہے۔۔۔ آخری اشاپ تک انتظار کریں وہیں کچھ ہوگا“
میں آفس فون کر دیتا ہوں، وہ اسے کھولنے کا انتظام
رکھے۔“ ٹکٹ چیک کرنے کہا۔

آخری اشاپ اتنی دور اور پھر رات۔۔۔ ”مرحہ نے
گھرے گھرے سانس لے کر خود کو نارمل رکھنا چاہا اور نہ
غصے سے وہ راؤ کے ساتھ سر پھوڑ لینے کو تھی یہ اس
نے کیا کیا اس نے کارل جیسے فتور سے ٹکر کیوں لی کیا
ضرورت تھی، کتنی پاگل تھی! ”مرحہ۔ ایک ایسی لڑکی
جو سردیوں کی راتوں میں بچن تک اکیلے پانی پینے نہیں
جایا کرتی تھی نے دین کو کارل کی ویڈیو بھج دی۔ ایک
ایسی لڑکی بھی جو جو ہے کو پھدکتے دیکھ کر آسمان ہلا دینے
والی چیخیں مارنے والی نسل سے تعلق رکھتی تھی، اس
نے ”دی کرائے کڈ“ کی نسل سے تعلق رکھنے والوں
سے ٹکر کیوں لی۔ اس نے یہ فاش غلطی کیوں کی۔
ایک ایسا ماحول جہاں لڑکیاں ہلکی رفتار سے چلتی بس
کے پائیدان کے راؤ کو پکڑ کر اس میں بیٹھ جانے کو بڑا
معرکہ جمھکتی ہیں وہ یونیورسٹی آرک سر کر لینے والوں کو
کیسے اور کیوں للکار بیٹھی۔

وہ ایک ایسے ماحول سے تھی جہاں لڑکی کار تو چلاتی

ہے اسے دھکا نہیں لگاتی وہ سر اٹھا اٹھا کر اوپچی دیواروں
عمارتوں، پہاڑوں کو ضرور دیکھتی ہے انہیں پھلانگنے کا
نہیں سوچتی۔ حفاظت کے پیش نظر اگر کوئی گن
پستول گھر میں رکھی ہے تو وہ نامر اسے ہاتھ میں پکڑ کر
نہیں دیکھتی کہ اسے کھول کر اس میں میگزین کیسے
بھرتے ہیں اور اسے چلانے کے لیے سیکنے کی جرات
بھی نہیں کرتی کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ بھلے سے
چور ڈاکو، قاتل اس کے پیٹ میں دو گولیاں اتار دے وہ
ایک گولی بھی چلانے کی جرات نہیں کرے گی کہ یہ تو
اس کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ کام تو اس کا باپ کرے گا
بھائی شوہرا بیٹا وہ نہیں۔

بجلی کے فیوز ٹھیک کرتے یہ اپنے باپ بھائی کے
پاس اوزار لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اس فیوز کو خود سے
ٹھیک کرنے کی غلطی نہیں کرتی۔ سیکھنے کا تو سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا وہ کیوں سیکھے اور کرے یہ کام تو
مردوں کے ہیں نا۔ ناجانے کسی کائناتی کتاب میں لکھا
ہے کہ یہ سارے کام صرف مرد ہی کریں گے۔

بس کی نشست سے بندھی بیٹھی وہ رو دینے کو ہو گئی
لیکن روئی نہیں، بائیں ہاتھ سے فون نکالا دیرا کو کیا وہ تو
بھڑک اٹھی۔

”تم پہلے ہی میری ناک کٹوا چکی ہو۔“
یعنی دیرا کی ناک کا دارو مدار بھی اسی پر تھا۔
لوٹ گئی ناک۔۔۔ آتی ہوں میں اس وقت تک تم
جی بھر کر رولوس مینڈکی۔“ وہ دھاڑی۔

آخری اشاپ پر بس رکی تو ٹرانسپورٹ کے عملے کا
ایک رکن اس کی ہتھکڑی کھولنے کی کوشش کرنے
لگا۔ رات کے اس وقت وہ کٹر حاصل کرنے میں ناکام
ہو چکے تھے۔ ہانپتی کانپتی دیرا بس میں آئی اس کا سانس
بری طرح سے پھول رہا تھا۔

”ہائیں میں کرتی ہوں۔“ آتے ہی اس نے سب کو
ایک طرف کیا اور ہاتھ میں پکڑی باریک سلاخ سے
چند منٹ کی کوشش سے اس کی ہتھکڑی کھول دی۔
جب وہ ہتھکڑی کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی تو
عملے کے چھ ارکان اسے مشکوک انداز سے دیکھ رہے

”تم پولیس میں ہو یا“ ایک نے پوچھ ہی لیا۔
”میں پولیس میں کیوں ہوں گی میں سابقہ سی آئی
اے ایجنٹ ہوں۔“ دیرا نے بھنوس تان کر سنجیدگی
سے کہا۔

”سابقہ کیوں؟“ شک اور پرہیز گیا۔
”میں نے بارک اوباما کو قتل کرنے کی کوشش کی
تھی، گن میں اس کی کینٹی پر رکھ چکی تھی۔“ دیرا نے
پیسے سے زیادہ سنجیدگی سے کہا اور اسے لے کر بس سے
اتر آئی۔ ان چھکی شکلیں دیکھنے لائق تھیں۔
”تم واقعی میں سی آئی اے کی ایجنٹ رہ چکی ہو۔
تم نے اوباما کو مارا کیوں نہیں؟“ دیرا کو سب آتا تھا پتا
نہیں وہ مانچسٹر یونی سے ماسٹرز ان بزنس ایڈمنسٹریشن
کیوں کر رہی تھی۔

دیرا نے جواب میں اس کی گردن دیوچ لی۔
”تم میرے پیلا کے پاس جاؤ گی یا انہیں یہاں بلوا
لوں۔“

انہیں بلوالو۔ لیکن کارل کے لیے۔۔۔ التجا کرتی
ہوں میں دیرا!“ ”مرحہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”وہ چھوٹے موٹے کیس پینٹل نہیں کرتے۔“
دیرا نے غصے سے اپنی رولر کو سٹر کو اشارت کیا۔
”تمہارے لیے آسکتے ہیں تم ہو مشن امپا بیل۔“
سارے راستے دیرا غصے سے بڑبڑاتی رہی اسے
ساتی رہی وہ چپ کر کے بی بی سی۔ دیرا سروس سختی
رہی۔

دیرا نے سائیکل روکی پر وہ مشل کاک تو نہیں تھا۔
وہ تو وہ جگہ تھی جہاں عالیان رہتا تھا اور ساتھ ہی کارل
۔۔۔ ہمارا کارل۔

”دیرا! تم یہاں کیوں آئی ہو؟“
”چلو“ تم اندر ایک مکا مارو کارل کے منہ پر۔“ دیرا
نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے لیا۔
”نہیں میں نہیں جاؤں گی اندر مجھے کچھ نہیں کہنا
کارل سے۔۔۔ بس ختم۔“
”پھر مجھ سے دوستی ختم کرو۔“ Anselm ہال

کے باہر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑی تھیں، ایک ہاتھ
چھڑا کر بھاگ جانے کو تھی ”مرحہ“ ایک ہاتھ سے
ٹھیک کر اندر لے جانے پر مصر تھی ”دیرا“
”مجھے تمہاری جیسی بزنل دوست نہیں چاہیے۔“
دیرا دھاڑی۔

”میں اندر چلی جاتی ہوں لیکن میں کارل کو کچھ
نہیں کہہ سکتی۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔
میں یہ نہیں کر سکتی۔“

جواب میں دیرا اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی اور
اندر داخل ہوتے ہی گرن دار آواز میں نظر آنے والے
پہلے لڑکے سے کارل کے بارے میں پوچھا۔ کوریڈور
میں اور بھی لڑکے تھے دیرا کی آمد اور ایسی آواز سے
متوجہ ہو گئے۔

”وہ وہاں میوزک بار میں۔“ شاہ ویز نے پورے
دانت نکال کر ہاتھ کا اشارہ کر کے بتایا بھی اور ساتھ
آگے کو بھی ہو گیا کہ آئیے محترمہ کارل پر جو عذاب
نازل کرنا ہے اس کے لیے میں آپ کو چلتا ہوں اس
کار خیر میں میرا حصہ بھی ڈالنے دیجئے۔

آس پاس کے جو دو سرے تھے وہ بھی میوزک بار کی
طرف بڑھنے لگے ایسے بنا ٹکٹ کافر سٹ شو کون مس
کرنا چاہے گا بھلا۔

کچھ لڑکے اوپر کی طرف لپکے کہ باقی ہال میٹس کو
بھی بلالائیں کہ دیرا کارل کا پوچھتی اس وقت آئی ہے
اور اس انداز میں آئی جیسے ہال سے باہر روس کی فوج کو
پوزیشن لینے کھڑا کر آئی ہو، ایک ”دو“ تین۔۔۔ فائر۔
اندر نظر دوڑائی دیرا نے ”مرحہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام
رکھا تھا۔ میوزک بار کے دروازے میں کھڑے ہو کر
اس نے میوزک بار میں سامنے کاؤنٹر تھا جس کے پار
تین بار ٹینڈر کھڑے تھے کاؤنٹر کے عین سامنے
والے حصے میں کرسیوں اور میزوں کو پار کر کے اسنوکر
ٹیبیل رکھا تھا جس پر کارل اسنوکر کھیل رہا تھا۔ باقی
اسٹوڈنٹس ادھر ادھر کھڑے آٹھے بیٹھے تھے۔

کارل اسنوکر اسٹک (Stick) کو پکڑے ٹیبیل پر
جھکے ایک آنکھ کو بند کیے گیند کو ہٹ کرنے ہی لگا تھا کہ

پوری بوتل خالی کر دی۔ پھر ہاتھ باندھ کر ہنرمند
اسٹائل میں کھڑی ہو گئی۔
”اب کچھ بھی کر لو کارل! ایک ہفتے سے پہلے اس
شینل فانیو سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے ہیں
سائنس دان بن گئی تو ضرور اس خوشبو سے جلد چھٹکارا
پانے کے لیے کچھ کر دیں گی، لیکن میرے سائنس دان
بننے کے وقت کے آنے سے پہلے تک کے لیے سواری
کارل۔“

امرحہ کا جی چاہا کہ وہ تالیاں بجائے لیکن اس نے
ایسا نہیں کیا وہ پٹی تو میوزک بار کے دروازے کے
ساتھ شانہ ٹکائے کھڑے عالیان پر اس کی نظر پڑی وہ
بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور پیارا بھی۔ امرحہ نے سوچا
کہ وہ ایسے ہی کھڑا رہے اور باقی سب غائب ہو جائیں
تو کتنا اچھا رہے۔

امرحہ کا ہاتھ پکڑ کر ویرا یا ہرنگلی اور اپنے پیچھے انہوں
نے قصوں کا طوفان اٹھتے سنا، ہال کے اسٹوڈنٹس
کارل ہمارے کہہ کر دیوانوں کی طرح ہنس رہے تھے ان
میں عالیان بھی شامل تھا۔ ان سب نے مل کر میوزک
بار کے دروازے کو بند کر لیا تاکہ وہ باہر نہ جاسکے۔ کاؤنٹر
پر رکھی کسی کی سوٹ ڈرنک سے کارل نے اپنی
آنکھیں دھونی چاہیے لیکن شاہ ویز نے لپک کر وہ
ڈرنک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ سب نے ساری
ڈرنکس اٹھا کر کارل سے دور کر دیں ”امرحہ دی لاسٹ
ڈک۔ کارل دی آخ۔ خ۔ خ۔ خ۔“ عالیان نے اس
کے قریب جا کر اپنی ناک پکڑ کر کہا۔ کارل نے اسے
دھکا دے کر پیچھے کیا اور میوزک بار سے باہر جانا چاہا اس
کی آنکھیں جل رہی تھیں اسے ایک پل قرار نہیں آ
رہا تھا۔ لیکن سب لڑکی بار کے دروازے پر براجمان
تھے وہ اسے باہر جانے نہیں دے رہے تھے دھکا مار کر
پیچھے کر دیتے۔

”ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں۔“ کارل چلایا۔
”دیکھ لیتا۔ ابھی تو ہمیں سوکھ لینے دو۔ اف آخ
خ۔“
کارل نے عالیان کو دیوچ لیا۔ ”لو سوکھو مجھے۔ آؤ

ویرا وانت پیس کر کہا۔
”کارل! کارل نے آنکھ کھولی، مسکرایا اور اس
طرف سر گھما کر دیکھا جس طرف ویرا کھڑی ہی نہیں
تھی۔ ڈرامے باز۔ پھر اس نے سر اٹھایا ویرا کی
طرف گھمایا۔ ویرا اس کے ساتھ امرحہ۔ اور امرحہ
کے آگے پیچھے Anselm ہال کا مجمع۔ ”انس شو ٹائم
یونی چک۔“

Its show time uni chick
”امرحہ! تم آگے گئیں، کافی دیر لگ گئی تمہیں تو آنے
میں۔“ اس نے دیوار گیر کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔
”بہت سست ہوتی ہے ٹراپسورٹ کی انتظامیہ۔
اگر میں مینجسٹر کا میئر بن گیا جو کہ مجھے بننا ہی ہے تو میں
ضرور اس طرف توجہ دوں گا لیکن میرے میئر بننے کے
وقت کے آنے سے پہلے تک کے لیے سواری۔“
انسوکر اسٹک اس نے ایسے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جیسے
اے ایس فانیو زیرو کی Sniper Rifle یہ ویرا کو
نشانے پر رکھا تھا۔ ٹھا۔ Dhuzz
ویرا ڈیڈ مین کی سنجیدگی لیے اس کے قریب جا کر
کھڑی ہو گئی۔ ”ویرا یہ کر سکتی تھی۔“
”ویرا! تم مجھے اتنے پیار سے کیوں دیکھ رہی ہو۔
مجھے تشویش ہو رہی ہے میں دل کے عارضے سے
ہلاک ہونا نہیں چاہتا۔“

ویرا نے اپنا وہ ہاتھ جو اس کے کراس بیگ کی جیب
کے اندر تھا نکالا اور ہاتھ میں پکڑی بوتل کا سپرے اس
کی آنکھوں پر کر دیا۔ ایک دم سے۔
”آہ! کارل! چلا اٹھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور
تیزی سے پانی کی تلاش میں باہر کی طرف لپکنا چاہا کہ
ویرا نے دوسری بوتل نکالی اور آنکھوں کو گڑتے، آہ آہ
کرتے ادھر ادھر میز کر سی سے ٹھوکر کھاتے کارل پر
تیزی سے اسپرے کرنے لگی۔

”اوہ گوش۔ اتنی گندی بدبو۔“ ایک ایک نے
اپنی ناک پکڑ لی امرحہ کو بھی اپنی ناک پکڑنی پڑی۔
جتنے لڑکے کارل کے پاس کھڑے تھے وہ تیزی سے
کارل سے دور ہوئے۔ بدبو کی انتہا تھی بس۔ ویرا نے

میرے پاس۔“
عالیان کا بدبو سے دم کھٹنے لگا۔ کارل ایک ایک کے
قریب جا کر انہیں دلوچ رہا تھا ”آؤ گلے ملو مجھ سے۔
آؤ۔“ ساتھ وہ ہنستا جا رہا تھا عالیان تو ہنس کر دیوانہ
ہو رہا تھا۔
کارل نے رک کر چند ہی آنکھوں سے عالیان کو
دیکھا اسے یہ منظر اچھا لگا۔

”اسے تنگ کرنے میں بہت مزا آتا ہے اس کی
شکل دیکھنے والی ہوتی ہے۔“ کارل عالیان کی گردن
دبوچتے ہوئے کہا۔

شینل فانیو کی خوشبو بھی سوکھنے والی ہے۔ اف
اتنی بدبو۔ آخ۔“
”میں تمہاری ناک پھوڑوں گا۔“
”جتنی بدبو ہے یہ کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا۔
ہاں ایک ہفتے کے لیے خالی کر دو سب۔“

”کارل کو ہی نکال باہر کرتے ہیں ناسب۔“ شاہ ویز
چلایا۔
اور پھر سب نے مل کر اسے اٹھایا اور ہال سے باہر
پھینک آئے۔

ساری رات S.T. Anselm ہال میں ہی سب
چلتا رہا۔ ہنس ہنس کر ان کے سر درو کرنے لگے تھے وہ
اسے بار بار اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔
کارل کو عطر معطر کرنے کے بعد مینجسٹر کی سڑکوں پر
سے گزرتے ویرا ہنس ہنس کر پھاگل ہوئی جا رہی تھی۔
”تمہیں یہ سب کس نے سکھایا ہے۔ تم نے
میری ہتھکڑی بھی کھول دی۔“

”پاپا نے۔ فوجی رہے ہیں وہ۔ تم ڈگری لے لو تو
روس آنا۔“

”اچھا! کیا بالکل تمہارے جیسی ہو جاؤں گی؟“
”یا میرے جیسی ہو جاؤ گی یا پہلے سے بھی جاؤ گی۔“

ویرا سائیکل سے اتر گئی۔
”چلو تم سائیکل چلاؤ۔“
”مجھے نہیں آتی۔“
”چلاؤ گی تو آجائے گی۔“

”مجھے سیکھ کر کیا کرنا ہے۔؟“
”سیکھنے سے پہلے کیا کیوں نہیں کرتے۔“ ویرا نے
اسے زبردستی سائیکل پر بٹھایا اور ہینڈل کو پکڑے رکھا
لیکن اس نے بیٹھتے ہی سائیکل گرا دی۔ ویرا نے
اسے اٹھایا، بٹھایا اس نے چند ہینڈل مارنے کے بعد پھر
خود کو اور سائیکل کو گرا دیا۔ ویرا نے اسے پھر چلانے
کے لیے کہا۔

اگر سکھانے والا نہیں تھک رہا تھا تو سیکھنے والے کو
بھی کچھ شرم کرنی چاہیے تھی۔ سائیکل گر کر گر چلتی
رہی۔ امرحہ قریب ”قریباً“ سنسان ہوئی سڑکوں پر
سائیکل گر اور چلا رہی تھی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔
گر گر کر اٹھنا اٹھ کر گر جانا۔ ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے،
گرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ جلد ہو جانے سے
حرکت نہ کرنے سے خوف کھانا چاہیے۔ جب
ساری کائنات کتاب بنی کھلی پڑی ہو تو انسان کو شاگرد
ضرور بن جانا چاہیے۔ ویرا نہیں کرنی چاہیے۔ ویر
ہو جائے تو مزید ویر نہیں کرنی چاہیے۔

آسمانوں کے سب ہی دروازے کھلے پڑے ہیں۔
آسمان ان دروازوں کے اس پار کو دکھائیں۔ اس سے
اگلے پار۔ کیونکہ یہ سب انسان کو ہی کرنا ہے۔ اور
یہ سب انسان ہی کر سکتا ہے۔
زمین پیچھی ہوئی ہے اور فلک تباہ ہوا ہے اور کائنات
لامحدود پھیلتی جا رہی ہے اور ہر لمحے یہ پکار کرتی ہے
”آؤ اور مجھے پالو۔ میرے فائن ٹھن جاؤ۔“



”وقت تمہیں زندہ رکھے عالیان۔“
ہمارے تم پر فدا ہو جائیں۔ وہ تم سے جدا ہونے

پر تالاں رہیں۔
قسمت کا قلم اگر تمہارے لیے کوئی دکھ لکھنے کا ارادہ
رکھتا ہے تو میں سر کو سجدے میں جھکاؤں ہوں اور دعا
کرتی ہوں کہ ایسا کرنے سے پہلے قسمت کی یادداشت
کھو جائے اور وہ تمہارے نام دکھ لکھنا بھول جائے۔
جو دروازہ کھلتا ہے وہ بند بھی ہوتا ہے تم پر کبھی بند

دروازوں پر دستک دینے کی نوبت نہ آئے۔
رحمتوں کے دروازے تم پر کھلیں اور انہیں کبھی بند
ہونے کا حکم نہ ملے۔ اور تمہاری جان میں آب
حیات حلول کر جائے۔

پورے چاند کے آسمان اور چن من ستاروں سے
سجی رات میں وہ کھڑکی کے پاس کھڑی اپنے ہاتھ سے
پنائے کارڈ پر لکھ دی گئی ان دعاؤں کو زیر لب دہرا رہی
تھی بار بار۔ وہ ان میں مزید دعاؤں کا اضافہ کر رہی
تھی۔

”بے سکونی کے سائے اندھے اور ہرے ہو جائیں
تم تک آنے کے لیے انہیں کوئی راہ دکھائی اور بھائی نہ
دے۔“

وہ کھڑکی میں کافی دیر سے کھڑی تھی ہر آہٹ پر اسے
لگتا تھا بس وہ آگیا ہے جبکہ بارہ بجنے میں کافی وقت تھا۔
اور وہ وقت سے دس منٹ پہلے آگیا تھا۔ بیگ کو
پشت پر لٹکائے اس میں چھوٹا سا ایک چھپائے۔ بادام کا
مناسا ایک کاٹ لیا گیا تو وہ واپس جانے لگا۔ امرجہ اپنی
کھڑکی میں ہی کھڑی تھی نجانے کیوں اسے امید تھی
کہ وہ ایک بار تو ضرور اس کے کمرے کی کھڑکی کی
طرف دیکھے گا۔ لیکن جیسے خاموشی سے وہ آیا تھا ویسے
ہی خاموشی سے جا رہا تھا۔ وہ جا رہا تھا۔

اس کی چال میں شکست خوردگی اتنی نمایاں ہو گئی
کہ امرجہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا جو جگنو
اس کے گرد گول گول گھومتے نظر آئے تھے وہ اس کے
قدموں تلے مر رہے ہوئے لگے۔ وہ غمنا کر بجھ رہے
تھے۔

امرجہ کا جی چاہا کہ بھاگ کر جائے اور ان مردہ
جگنوؤں کو پھونکیں مار مار کر اس کے گرد گول گول
گھومنے پر مجبور کر دے ورنہ التجاہی کر لے۔ ورنہ
آواز دے کر اسے روک لے اور کہے کہ بادام کیک
مجھے چاہیے۔ ضرور ہی چاہیے۔ مجھے دے دو
عالیان۔ پلیز۔ لیکن اس نے آواز نہیں دی اور
اسے کیک بھی نہیں ملا۔

ابھی وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا کہ اس نے

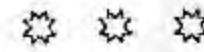
مڑ کر اس کھڑکی کی طرف دیکھا جس سے وہ ایک بار گواہ
تھا۔

امرجہ نے دیکھا کہ اس نے گردن کو موڑ کر دیکھا۔
ہاں اس نے دیکھا۔ اور پھر فوراً ہی گردن گھمائی جیسے
کسی نے اس کے پیروں تلے کی زمین کھینچ لی ہو۔
اپنے پیچھے اندھیرے کو چھوڑتے وہ چلا گیا۔ امرجہ
کھڑکی میں ہی کھڑی رہ گئی۔
”یہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ امرجہ نے
خود سے چھپ کر سرگوشی کی۔

”میں اس سے کبھی معافی حاصل نہیں کر سکوں
گی۔“ اپنے گالوں کو اس نے کھڑکی کی چوکھٹ کے
ساتھ ٹکرایا۔

”اب مجھے اس سے خوف آتا ہے اور یہ ایک
خوفناک جذبہ ہے۔“

قسمت کے اندھیرے جنگل میں سرسراہٹ ہوئی،
دعائیں ان میں سے ہو کر گزریں۔ امرجہ نے اللہ کو
اسی شدت سے یاد کیا جس شدت سے اس کے گم ہو
جانے کے بعد کیا تھا۔ اس نے دعا کی تھی کہ وہ گم ہو
چکے عالیان کو واپس لے آئے۔ اور اب بھی اس نے
یہی دعا کی۔ ”گم ہو چکا عالیان واپس آجائے۔ اے
خدا۔“



یہ اگلی رات کا قصہ ہے۔
وہ اپنی جاب سے واپس آ رہی تھی بس اسٹاپ کی
طرف پیدل۔ آج پھر سے اس نے ایک گاہک کا دس
ہزار پونڈ سے زیادہ کا بیل بنادیا تھا جبکہ اس کے جوتے کی
قیمت صرف سو پونڈ تھی۔

صبح اس نے اٹھ کر سفید کارڈ پر نیلے، پیلے، سرخ
سرخ ستارے چپکا دیے تھے پھر شٹل کاک کے لان
میں سے ایک پیلا پھول توڑ کر احتیاط سے بیگ میں
رکھ لیا تھا۔ زیادہ پھول وہ لے کر نہیں جاسکتی تھی۔

جلدی جلدی کرتے بھی جب وہ صبح اس کے
ڈیپارٹمنٹ تک گئی تو وہ کلاس میں جا چکا تھا۔ حالات

پہلے جیسے نہیں تھے کہ وہ اس کی کلاس میں جا کر کہتی کہ
میری بات سن لو، اسے اپنی کلاسز بھی لینی تھیں۔
عالیان کوئی لیکچر مس نہیں کرتا تھا اس کی آخری کلاس
کے وقت سے ذرا پہلے وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ آگئی۔

وہ دیر اور چند دوسرے دوست ایک ساتھ باہر
نکلے، عالیان کے ہاتھ میں چند کارڈز تھے اور اس کے
کر اس بیگ میں سے پھول جھانک رہے تھے۔ امرجہ
نے عالیان کے اکیلا ہونے کا انتظار کیا۔ اسے کارل کا
بھی ڈر تھا کہ وہ کہیں قرب و جوار میں ہی نہ ہو۔ عالیان
کو اپنی سائیکل کی طرف جانا تھا اس کی ساگرہ کا دن تھا
لیکن وہ مسکرا نہیں رہا تھا اس سے زیادہ تو وہ امرجہ کی
ساگرہ کے دن مسکرا رہا تھا۔

دیر عالیان کے ساتھ ہی تھی، ویرا کو بھی اپنی
سائیکل لینی تھی، لیکن ویرا نے اپنی سائیکل نہیں لی۔
وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی۔

امرجہ ذرا دیر خود کو چھپا کر کھڑی تھی۔ کھڑکی کی
کھڑکی ہی رہ گئی تھی۔

ویرا نے آج اتنی خوب صورت گلابی پھول والی
فراک گیوں پہن رکھی تھی۔ گلابی جوتے اور لمبے بالوں
کو اس نے آج کس محنت سے سنوارا تھا۔ امرجہ آج
اس کے ساتھ سائیکل پر نہیں آئی تھی جیسا کہ اب
اکثر وہ بونی بس میں آجایا کرتی تھی۔ وہ صبح دیر اکو دیکھ ہی
نہیں سکی تھی۔ ویرا جو بونی میں اپنی خوب صورتی کے
لیے بھی مشہور تھی آج اس خوب صورتی کو چیلنج کرتی
کیوں نظر آ رہی تھی؟

عالیان نے سائیکل چلائی اور ویرا نے بیٹھے بیٹھے
شرارت سے اس کی سائیکل کو گرانے کے لیے ہلایا اور
سائیکل ڈگمگا گئی۔

کتنا برا منظر تھا۔ ماچسٹر میں دیکھا جانے والا سب
سے برا منظر۔ ماچسٹر میں وقوع پذیر ہونے والا بدترین
منظر۔

یونیورسٹی کے درو دیوار سے آکاس بلیں لپٹ
گئیں۔ آکسفورڈ روڈ پر دلہنی جھاڑیاں جا بجا پھوٹنے
لگیں اور آکسفورڈ روڈ دلہل میں بدل گیا۔

چرچ کے گھنٹے کی ٹن ٹن ٹن نے ماچسٹر کے آسمان
کو سربراہا لیا۔ پیلا پھول بیگ میں رکھے رکھے اپنی
موت آپ مر گیا۔ سفید کارڈ پر چپکے ستارے جھڑنے
لگے۔ ”مہابت ہو وقت انسان کا فرماں بردار نہیں ہے۔“
اس کے بازو پر سخت گرفت پڑی۔ امرجہ چونکی وہ
بس اسٹاپ سے آگے نکل آئی تھی۔ وہ اتنی ست روی
اور معلق سی حالت میں چلتی رہی تھی کہ رات کافی
ہو چکی تھی۔

اس کے بازو پر پڑنے والی گرفت نے اسے پتلی
سڑک کے اندر گھسیٹا وہ چیخ مارتی اس سے پہلے ہی
ماسک سے منہ کو چھپائے اس انسان نے غرا کر کہا۔
”تمہاری آواز نفی تو میں تمہاری کھال اوھڑوں
گا۔“ کلچ کی آواز کے ساتھ ایک تیز دھار چاقو نکلا اور
اس کی پسلی کے ساتھ مس ہوا۔

سارے جہان کا خوف امرجہ کی آنکھوں میں سمٹ
آیا، بند سڑک کے نیم اندھیرے ماحول میں اس نے
کالے ماسک میں پوشیدہ آنکھوں کو دیکھا جن کی
پتلیاں بمشکل دکھائی دے رہی تھیں۔

”کیا چاہتے ہو۔ میرے پاس بیس پونڈ سے زیادہ
نہیں ہیں۔“ امرجہ کی آواز کانپ رہی تھی ایک خدشہ
اسے یہ بھی تھا کہ یہ کارل ہو گا اسے ڈرا رہا ہو گا۔

ماسک مین نے پوری قوت سے اپنا دایاں پیر اٹھا کر
امرجہ کے پیر پر دے مارا، تکلیف سے امرجہ بلبلاتا تھی
اگر اس نے جو گر زہ پہن رکھے ہوتے تو اس کے پیر کی
کھال ادھڑ جاتی۔ پیٹ کے بل امرجہ سڑک پر بیٹھتی
چلی گئی اور جیسے ہی وہ جھکی اس نے پورا زور لگا کر امرجہ
کو ٹانگ ساری۔ اس بار امرجہ سڑک پر گر گئی۔

”کون ہو تم کیا چاہتے ہو۔“ خوف سے امرجہ
چلائی۔

وہ نیچے اس کے قریب جھکا اور ہاتھ میں پکڑے چاقو
کو اس کے بازو پر رکھا اس کی نوک کو اندر کرنے لگا۔
چاقو امرجہ کی کھال سے چھوٹا۔ اندر گھسا۔ خوف
سے امرجہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں وہ اس کی آنکھوں
میں دیکھ رہا تھا جیسے اسے بہت مزا آ رہا تھا یہ کرتے

”بتایا تو ہے تمہاری کھال۔“ چاقو کو اس نے گھمایا۔ امرجہ نے سارا خوف بالائے طاق رکھ کر چیخ مار دی اور پیچھے کی طرف بھاگی۔

”ہیلپ!“ وہ بڑے آرام سے اٹھا اور اس کی طرف آیا۔ امرجہ کی قسمت خراب کہ وہ تکی گلی نما سڑک بند تھی اور امرجہ اس کے آگے سے ہو کر نہیں جاسکتی تھی۔

”ہیلپ۔ ہیلپ!“ ساتھ اس نے بیک میں سے فون نکالنا چاہا لیکن اس کے ہاتھوں میں اس بری طرح کپکپاہٹ تھی کہ وہ بیک کی زپ بھی نہیں کھول سکی وہ بند گلی کے آخری کنارے کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی تھی اور وہ بڑے مزے سے اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

”اگر اب تمہاری آواز نکلی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔“

”خدا یا۔ اے اللہ۔“ امرجہ نے بلند آواز سے کہا وہ بس بے ہوش جانے کو تھی۔

”اللہ۔“ وہ استغاثہ نہ بنا۔ دیوار کا سیار الینا امرجہ کے لیے محال ہو رہا تھا وہ بس گر جانے کو تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ ایک تیز نارج کی روشنی گلی میں چمکی۔ ماسک مین تیزی سے بھاگ گیا نارج جو الگ گلی کے اس حصے کی طرف آیا جس طرف امرجہ تھی۔ خوف اور تکلیف سے امرجہ کو ٹھیک سے دیکھنے اور سمجھنے میں وقت لگا۔

”اوہ خدا یا۔ کیا ہوتا رہا ہے یہاں؟“ وہ امرجہ کو دیکھ کر بری طرح چونکا امرجہ نیچے بیٹھ گئی اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ امرجہ نے خوف سے ہی اسے بھی دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

”نہو۔ میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔“ آدمی جلدی سے گیا اور پانی کی بوتل لے آیا۔ ”لو یہ پو اور اپنی سانسیں درست کرو۔ پرسکون

ہو جاؤ میں ابھی پولیس کو ملاتا ہوں۔“ امرجہ ہاتھ سے پسینہ صاف کرنے لگی۔ اس کی سانسیں قابو میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

”اس طرف ساتھ ہی میرا اسٹور ہے میں کوڑا دان میں کوڑا ڈالنے آیا تو مجھے ہیلپ کی آواز آئی۔ تم میرے اسٹور میں چل کر بیٹھ سکتی ہو“ او میرے ساتھ میں پولیس کو فون بھی کرتا ہوں۔“

”نہیں پولیس رہنے دیں۔ کیا آپ مجھے ٹیکسی میں بٹھا سکتے ہیں؟“ ”رکو توڑی! تم ایسے نہیں جاسکتیں تم غیر ملکی ہو تمہارے ساتھ ماچسٹر میں یہ سلوک برداشت نہیں کیا جائے گا جو ہم خود اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکتے۔ او میرے ساتھ۔“ وہ نیم بوڑھا آدمی آگے چلنے لگا۔

امرجہ کو ناچار اس کے ساتھ جانا پڑا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اس کا اسٹور تھا۔ کہنی سے اوپر اس کے دائیں بازو میں کافی تکلیف تھی وہ جگہ خون سے لیلی ہو رہی تھی ”نہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟“

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اسے میرا بیک چاہیے تھا بس۔“

تھوڑی دیر میں پولیس آگئی امرجہ نے سارا واقعہ بتا دیا۔

”آپ پہچانتی ہیں اسے؟“ پولیس مین پوچھ رہا تھا۔ ”وہ ماسک میں تھا۔“

”آواز؟“ ”نہیں جانتی اسے۔ آواز بھی نہیں۔“

”آپ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہیں اکثر اسٹوڈنٹ ایسے مذاق کرتے ہیں۔“ ”نہیں۔ وہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تو نہیں لگتا تھا اسے میرا بیک چاہیے تھا۔“

”کیا اس نے مانگا تھا یا چھینا تھا؟“ ”مانگا تھا۔ میں نے نہیں دیا تو مجھے گرا دیا اس نے۔“

”اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بھی آپ نے اسے دینے سے انکار کر دیا جس میں صرف بیس پونڈ تھے“ آپ کو ڈر نہیں لگا؟“

”بو کھلا ہٹ میں میں نے انکار کر دیا۔ سب ایک دم سے ہوا۔“

پولیس کی گاڑی ہی اسے گھر چھوڑ گئی۔ گھر آکر اس نے بازو کا حال دیکھا۔ گہرے رنگوں کی وجہ سے خون نظر نہیں آتا تھا۔ فرسٹ ایڈ باکس کچن سے لا کر اس نے بہت مشکل سے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی پٹی کی۔ فرسٹ ایڈ باکس میں کوئی اینٹی بائیوٹک نہیں تھی اور اسے بازو پر کافی تکلیف ہو رہی تھی گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر اس نے پی لی اور کمرے میں گرم صم بیٹھ گئی۔

خاموش۔ بالکل چپ۔

”میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔“ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خود سے کہا۔

”میرے بازو میں تکلیف ہے، لیکن میں اسے برداشت کر سکتی ہوں۔ مجھے رونا آ رہا ہے، لیکن میں روؤں گی نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں، لیکن میں اپنے خوف پر قابو پاؤں گی۔ یہ عمل کارو عمل ہے۔ میں اسے اپنی حکمت عملی سے بدل دوں گی۔ میں اسے ٹھیک کر لوں گی۔ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں اکیلی ہوں، لیکن اکیلا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بزدل یا کمزور بن جایا جائے۔“

دیر صبح کے قریب گھر واپس آئی تھی۔ عالیان کے کلاس فیلوز اور ہال میٹس نے اس کے لیے برتھ ڈے پارٹی کا انتظام کیا تھا اور وہیں تھی رات بھر۔

روسی دھن کی سی بجائی جب ویرا اپنے کمرے میں چلی گئی تو امرجہ نے اٹھ کر اپنے بیک میں سے کارڈ نکال کر الماری میں رکھے باکس میں رکھا، پھول تو اس نے مسل کر آکسفورڈ روڈ پر ہی پھینک دیا تھا اگر وہ پھول عالیان کو دے بھی دیتی تو کیا وہ لے لیتا تو چلتے چلتے کہیں بھی پھینک دیتا، وہ تو رات بھر مزے سے پارٹی کرتا رہا تھا۔ امرجہ بھی ماچسٹر میں موجود ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا۔

کبھی تو وہ اس کی دوست رہی تھی اس کبھی کے لیے ہی وہ اسے پارٹی میں بلا لیتا۔ امرجہ شو اسٹور پر سارا وقت اس پارٹی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

گھسی ہوئی تین جینز کی پینٹوں میں سے کوئی ایک اس نے پہنی ہوگی شاید ہلکے مٹے نیلے رنگ کی اور یونیفارم کی طرح جانی جانے والی کئی کئی بار استعمال کئی جانے والی چند گنی چنی مخصوص ٹی شرٹس میں سے کوئی ایک شاید کالی جس کی پشت پر موٹے تناور درخت کی صرف جڑیں سرسبز رنگ میں پھیلی پڑی تھیں اور جو عالیان کو بہت پسند تھی یا شاید نیلی پر سفید وہی سفید جس کی فرنٹ پر سرچ می (ڈھونڈ لو مجھے) لکھا تھا۔

”آخر تمہارا کیا مطلب ہے کہ کیا ڈھونڈ لیا جائے تم میں سے؟“

”جنہیں کچھ ڈھونڈنا ہوگا وہ کیا کیوں تو نہیں پوچھیں گے نا۔ وہ تو بس کر گزریں گے۔“

”کیا کر گزریں گے؟“ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ”تم نہیں سمجھو گی۔“

اور وہ نہیں سمجھی تھی۔ ٹھیک کہا تھا اس نے۔ اس کے پاس گھسے ہوئے اور پرانے کپڑے ہی تھے یہ میں نے چار سال پہلی تھی۔ یہ تین سال پہلے یہ جوتے جرمنی، فرانس، یونان تک جا چکے ہیں، ابھی بھی دیکھ لو کتنے اچلے اچلے ہیں اور مضبوط بھی، ان کے ساتھ مزید تین چار ٹورز کیے جاسکتے ہیں۔

”تم کافی نجوس ہو۔ پرانی شرٹس کو تم خود تراش خراش لیتے ہو یا جو کو دے دیتے ہو اور وہ فرانس کے قدم و جدید تجریدی آرٹ تمہاری شرٹس پر بنا دیتی ہے مجھے تو اس کی بنائی علامتوں سے بغاوت کی بو آتی ہے۔“

”ہا ہا۔ باغی ہی ہے اس کے تجریدی آرٹ سے بنی شرٹس کو جب میں پہنتا ہوں تو اسے بہت آرڈر ملتا ہے اسی لیے تو وہ اتنی امیر ہے۔ میں تو اس کا چلتا پھرتا ماڈل ہوں اور میں نجوس بالکل نہیں ہوں امرجہ! صرف فضول خرچ نہیں ہوں۔ میرے اس

کر اس بیگ کو دیکھو، بتاؤ یہ کتنا پرانا ہے؟“
کم سے کم دس سال پرانا۔“ امرجہ نے چڑ کر کہا۔

”ہاں۔ نہیں یہ یونی کے پہلے دن سے میرے ساتھ ہے چند ایک بار پھٹ چکا ہے، لیکن میں اسے سلائی کر دیتا ہوں دھولتا ہوں۔ میں ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہوں فیشن ماڈل نہیں جونت نئے کپڑوں کو پہن کر ہی یونیورسٹی آسکتا ہے بس۔ یہ بیگ یہ جوئے اور کپڑے صرف استعمال کی چیزیں ہیں انہیں چیزیں ہی رہنے دینا چاہیے۔ جنون نہیں بنا لینا چاہیے۔ انسانی ترقی کا راز ان میں ہے نا ہی یہ اس ترقی کے رضا کار ہیں ان کے لیے پاگل ہونا پاگل بن ہے۔“

”ایک سال میں تم کتنی خریداری کرتے ہو؟“
”بہت کم ضرورت پڑتی ہے، ماما، مورگن، شارلٹ کرسس پر گفت دے دیتی ہیں۔ کچھ دوست جو موٹے ہو جاتے ہیں یا جن کی وارڈروب میں مزید گنجائش نہیں رہتی کپڑے جوتے رکھنے کی وہ کم قیمت پر نیلامی کر دیتے ہیں میں اور کارل وہ لے لیتے ہیں وہ بھی اگر بہت زیادہ ضرورت ہو تو۔“

”تو تم اپنے پیسوں کا کرتے کیا ہو؟“ امرجہ کو حیرت تھی ماما مہر کے بیٹے کی یہ حالت تھی اور وہ جاب بھی تو کرتا تھا۔

”ویل یہ ایک راز ہے۔ ویسے تمہارے پیلا کیا بہت امیر ہیں، تم کتنے نت نئے انداز کے کپڑے بدلتی ہو، یونی کے پہلے دن جو تم نے لباس پہنا تھا، وہ میں نے دوبارہ نہیں دیکھا۔“

”وہ گرمیوں کے لیے تھا۔ گرمی آئے گی تو استعمال کروں گی۔“

امرجہ جھوٹ بول رہی تھی، اپنا وہ سوٹ وہ این لون کو دے چکی تھی۔ کیوں کہ امرجہ کو اچانک سے وہ برا لگنے لگا تھا۔ اپنی طرف سے اتنی کفایت کرنے کے بعد بھی وہ ہرمینے اپنے اسٹور سے کم قیمت کے دو جوڑے جوتے ضرور لے لیتی تھی۔ کافی ساری جینز لے چکی تھی، ٹاپ بھی، گرم کوٹ، جیکٹس، بیگز اور دستارے تو اس کے پاس اتفاق سے اتنے ہو چکے تھے کہ

انہیں کاٹ کر سی کر ایک سویٹر بن سکتا تھا اور اصل اسے دستانوں کی لباس کے ساتھ میچنگ کا خیال ہو گیا تھا اور پاکستان سے جو وہ گرم کپڑے لائی تھی ان کے ساتھ دستانوں کی میچنگ کرتے کرتے وہ اتنے ہو گئے کہ بس بہت ہی ہو گئے۔

امرجہ عالیان کی شرٹس کو انگلیوں پر گن سکتی تھی اور وہ گن رہی تھی۔

تو اس نے وہ پہلے براؤن رنگ کی جو جو کے تجریدی آرٹ سے سچی شرٹ پہنی ہوگی۔ بلیک جینز پر پھر اس نے پھونک ماری ہوگی اور کیک کاٹا ہوگا اور کارل کے منہ میں ڈالا ہوگا شاید کیک کارل نے ہی کاٹ لیا ہو اور موم بتیوں کی جگہ کوئی راکٹ فٹ کر دیا ہو کیک پر اور کیک کو عالیان کے منہ میں ڈالنے کے بجائے منہ پر تھوپ دیا ہو۔ ساتھ ساتھ ان غباروں کو پھوڑا گیا ہوگا جن میں کارل نے پٹانے بھرے ہوں گے جو زمین پر گرتے ہی خود بخود پھوٹنے لگتے ہیں، کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے ساتھ، پٹاخوں کے گرتے ہی سب چیخیں مارتے خاص کر لڑکیاں ادھر ادھر اچھلی بھاگی پھرتی ہوں گی۔

اور پھر تیز میوزک لگایا گیا ہوگا اور سب ساتھ ایک آواز میں گاتے ہوں گے۔

its my friend's birthday
So dance buddy Dance
— Dance — Dance —

عالیان کے گرد انہوں نے گول دائرہ بنالیا ہوگا، ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ شانے دائیں بائیں دگمگاتے گھومتے جاتے ہوں گے۔

it's my friend's Birthday
So I am dancing...

امرجہ گم صم حالت سے چونکی۔

"it's my Friend's Birthday
So i am praying"

امرجہ نے آنکھیں بند کر کے اس کے لیے دعا کی۔ اگلی صبح وہ یونی نہیں جاسکی۔ دیر سے سو کر اٹھی۔

اسے بخار ہو رہا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر کو بتایا کہ حادثاتی طور پر وہ اپنا بازو ایک لوہے کی سلاخ سے زخمی کر بیٹھی اس کے زخم میں سو جن بھی بہت اور اس کے لیے بازو کو حرکت دینا مشکل تھا۔ اسے ہر حال میں پانی جانا تھا، لیکن اس کا بخار بڑھ رہا تھا اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ آدھے راستے سے ہی گھر واپس آگئی، تیز دھار چاقو اس کی کھال میں گھسا تھا زخم تازہ تھا تو اتنی تکلیف نہیں تھی، لیکن اب تو اس سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گھر آکر سو گئی۔

اسے اتنا تیز بخار ہو گیا کہ وہ مدھوشی میں بڑبڑانے لگی۔ سادھنا رات اس کے کمرے میں ہی سوئی اور جب اگلی صبح وہ اسے سوپ پلا رہی تھی تو وہ تذبذب سے امرجہ کو دیکھنے لگی۔

”اگر یہ سوپ تم نے پینا ہے تو پی لو پلیز مجھے ایسے نہ دیکھو۔“ امرجہ نے مذاق کیا۔

”تمہارے اور عالیان کے درمیان کچھ ہوا ہے؟“
”کچھ کیا۔ کچھ بھی نہیں۔“ دائیں بازو کی تکلیف پورے جسم میں دوڑ گئی۔

”ویرا عالیان کی برتھ ڈے پارٹی میں گئی تم کیوں نہیں گئیں؟“

”تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ لوگ کیسی کیسی شرارتیں کرتے ہیں پارٹی میں ڈاؤن منع کر دیا تھا۔“
”تمہارے اور اس کے درمیان کوئی ناراضی ہے؟“
پہلے تم اس کی کافی باتیں کر لیا کرتی تھیں میرے ساتھ۔“

”نہیں۔ وہ مصروف ہوتا ہے بہت۔ اس کے اور دوست بھی تو ہیں، میں اس کے لیے اتنی اہم نہیں ہوں۔“

”کیا تمہیں یہی دکھ ہے کہ تم اس کے لیے اتنی اہم نہیں؟“

”دکھ نہیں، دکھ کیوں ہو گا مجھے؟“
”تو پھر امرجہ تم رات بھر اس کا نام لے کر روتی کیوں رہی ہو؟“

امرجہ خاموش سادھنا کو دیکھتی رہی، لفظوں کو اس کے حلق سے نکلنے میں وقت درپیش تھی۔

”میں روتی رہی ہوں؟“

”اتنی اونچی آواز میں کہ مجھے کمرے سے باہر جا کر دیکھنا پڑا کہ آواز گھر میں کہاں تک جا رہی ہے۔“

”بخار میرے سر کو چڑھ گیا ہوگا۔“

”بخار۔ تم اس طرح رو رہی تھیں کہ میں بھی رونے لگی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور میں نے پرا تھنا کی کہ بھگوان تمہیں سکون دے۔“

”میں۔ میں دادا کو یاد کر رہی ہوں گی۔ پتا نہیں ڈاکٹر نے کل کیسی دوا دی تھی۔“

سادھنا نے کھڑکی کے پردے اٹھا دیے، باہر روشن دن نکلا تھا، دھوپ چمک رہی تھی مانچسٹری دھوپ لاہور کی دھوپ کی چھوٹی، بن سی۔ اوپری من سے روٹھ جانے والی سیلی سی۔ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دب کر دس بنی تھی سی پٹی کی ایویں، ایویں شرماہٹ سی اور کسی جان سے پیارے کی ”پٹی کٹی“ سی بھی۔



”اور کتنے دن بیمار رہنا ہے؟“

ویرا اچھل کر اس کے بیڈ پر کودی، امرجہ کا زخمی بازو بال بال بچا جسے وہ کشن پر رکھے نیم دراز سی تھی اس نے ویرا کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا بازو کے زخم کا تو بالکل بھی نہیں۔

”میرا تو دل چاہتا ہے اب بیماری رہوں۔“ اس کے اتنے یاوہ سانہ انداز پر ویرا چونک سی گئی۔

”امرجہ! پارٹی سب دوستوں نے مل کر عالیان کو دی تھی، سربراہ پارٹی تھی، اگر عالیان کی طرف سے ہوتی تو تم بھی وہاں ہوتیں، وہ تمہیں بھی بلاتا۔“

امرجہ کو تھوڑا سا سکون ملا، ہاں اگر وہ پارٹی کا انتظام کرتا تو اسے بلاتا، لیکن وہ پارٹی شادی کرنے والوں میں سے نہیں تھا جو کپڑوں پر پیسے ضائع نہیں کرتا تھا وہ پارٹی پر کیوں کرے گا۔

”تم اپنے گھر پارٹی کرتی تھیں؟“ وہ اس کی سالگرہ سے اگلے دن پوچھ رہا تھا۔

”پارٹی؟“ امرجہ بڑبڑا کر رہ گئی جس طرح سے اس کا یوم پیدائش مشہور ہو چکا تھا وہ تو صرف ”یوم سیاہ“ یا ”یوم دفغان بلا“ کے طور پر ہی منایا جاسکتا تھا۔

”نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں۔“
”گھر میں کیک کاٹ لیتی ہوگی، دوستوں کے ساتھ۔۔۔ ہے نا۔“

”نہیں (آہ بھر کر) اس کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ دادا کے ساتھ پہلے بادشاہی مسجد جاتی تھی نقل پڑھنے شکرانے کے۔ دادا کہتے ہیں کہ اپنی پیدائش کے دن زیادہ عبادت کرنی چاہیے خدا کو تانا چاہیے کہ ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں بنایا اور کس محبت سے بنایا۔ ہمارے لیے نبی بھیجے، ہمارے لیے اپنے پیغامات آسمان سے اتارے۔ ہمیں خدا کو تانا چاہیے کہ ہم خوش ہیں کہ ہمارے لا وجود کو وجود میں لانے پر وہ راضی ہوا۔“

”گنڈ پھر۔۔۔؟“ عالیان متاثر نظر آنے لگا۔
”پھر وہ مجھے میری پسند کا گفٹ لے دیتے اور میری پسند کے بارک لے جاتے اور رات میں میری ہی پسند کے ہوٹل میں کھانا کھلا دیتے۔“ امرجہ کو یہ سب بتاتے ڈر بھی تھا کہ وہ یہ نہ پوچھ لے کہ ہر جگہ صرف دادا ہی کیوں؟

”میں متاثر ہوا ہوں امرجہ۔!“
”اور تم۔۔۔ تم کیا کرتے ہو؟“
”کرتا تو نہیں ہوں، لیکن کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دونوں آنکھیں میچ کر پھر انہیں کھول کر کہا اور مسرے سے مسکرانے لگا۔

”میں چاہتا ہوں کہ جب میری سالگرہ ہو تو میں سر میں بن جایا کروں، بے شک صرف ایک گھنٹے کے لیے اور ماما کو اڑا کر اپنے ساتھ لے جایا کروں دور بہت دور بادل کے ایک ٹکڑے پر تیز ہوا موم بتی کو بجھا دے اور میں اور ماما مل کر کیک کاٹیں یا پھر میں انہیں دکنوریہ فال لے اٹوں۔ گرتے ہوئے پانیوں کی پوچھاڑ کے درمیان کسی اونچی نوکیلی چٹان کے کنارے۔ پانی کے پروے کے بس اتنے قریب کہ ہاتھ بڑھا کر ہاتھ گیلے

کر لو۔ منھی منی پانی کی چھینٹیں میرا کیک گیل کر رہی ہوں اور کبھی میں پیٹر کے مجھے کو احترام سے اٹھا کر اس کی کشتی سے نیچے رکھوں اور اس کی کشتی کو سمندر میں لے آؤں اور۔۔۔“

”میں خوف زدہ ہو رہی ہوں عالیان۔“
”اگر وہ سپر مین نہیں بھی بنا تو امرجہ کو ڈر تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے یہ سب کر ہی لے گا۔ اور اس کے خواب کیسے بڑے بڑے تھے۔ پونو بڑے بڑے؟ پابل کے ٹکڑے پر جا کر کیک کاٹنا۔ شکر ہے اس نے آتش فشاں کے اندر جانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ دیرالے کمرے سے گٹار لے آئی تھی اور اسے کوئی روسی نظم سنانے لگی تھی۔ گاتے ہوئے وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ کوئی بھی اس پر غور ہو سکتا تھا۔ لیکن امرجہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس پر غور ہونے کا بھلا اسے کیا ضرورت تھی اتنی پیاری گلابی فراک پہن کر عالیان کی سائیکل پر بیٹھنے کی۔“

”مجھے یہ شک سائیکل ہے کہ تم مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی ہو؟“ ویرا نے درمیان میں ہی رک کر پوچھا۔

”تم اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ دل چاہ رہا ہے تمہیں کھا جاؤں۔“ اب امرجہ اسے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اسے کھا ہی جانا چاہتی ہے۔

”یہ پیار سے کھا جانے والا انداز تو نہیں ہے۔“ ویرا دوسرا روسی گانا گانے لگی۔
این اون، ساوہنا بھی اس کے کمرے میں آگئیں بعد ازاں لیڈی مہربانی۔

اس کی اتنی سی بیماری پر وہ کیسے کیسے اس کا دل بھلا رہے تھے۔ وہ کوئی دنیا جہان کی دولت نہیں لٹا رہے تھے اس پر۔ صرف ذرا سی توجہ دے رہے تھے اور یقین جانیں ہر بیمار کو ہر تکلیف میں مبتلا کو بس ذرا سی توجہ کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

شام کو سالی اس کی خیمیت معلوم کرنے آیا، امرجہ نے اسے فون کر کے سب بتا دیا تھا۔ وہ اس کے لیے پھول لایا تھا۔

”تم اس واقعے کے بارے میں کسی سے بات نہ کرنا سالی!“

”ظاہر ہے ایسا ہی کروں گا۔۔۔ لیکن تم اس کے پاس ضرور جانا۔“

”کیا مجھے جانا چاہیے؟“
”ہاں بالکل۔۔۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں خوف زدہ نہیں ہوں مجھے جانا تو تھا اس کے پاس اس لیے میں نے پولیس سے جھوٹ بولا۔“
”بس ٹھیک ہے تم نے ٹھیک کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بہتر انداز سے سوچ رہی ہو۔“

”مجھے یہی سب کرنا تھا سالی! ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی۔“

صحت یابی کی دعائیں دیتا سالی چلا گیا، لیکن صرف کمرے سے۔ نشست گاہ میں لیڈی مہر کی اس سے مڈبھیر ہو گئی تھی اور وہ انہیں نجانے کون کون سی کہانیاں سن رہا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔

”تمہاری یونیورسٹی میں کتنے مزے مزے کے لوگ پڑھتے ہیں نا۔“ ساوہنا اس کے لیے رات کا کھانا لائی تو ہنسی کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔
”تمہیں سالی اچھا لگا؟“

”ہاں۔۔۔ بہت۔۔۔ وہ یونیورسٹی کے ابتدائی دنوں کی باتیں کر رہا ہے۔“

”ساوہنا کیا تم آسمان کے ساتھ الٹا لٹکا چاہتی ہو؟ اگر ہاں تو تم عالیان کو فون کرو کہ وہ تمہاری ملاقات کارل سے کروادے۔ میں شرط لگاتی ہوں پھر تم ایسے کھل کر ہنس نہیں پاؤ گی۔“

”نہیں۔ مجھے کارل نہیں چاہیے وہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ شکر کرو، تمہاری باتیں سن کر اس سے خوف زدہ ہو کر میں نے اب تک ساچسٹر نہیں چھوڑ رہا۔“

”دادا بھی شکر کریں کہ اس کی حرکتوں سے سہم کر میں نے دنیا ہی نہیں چھوڑ دی کاش آج کل میں ہی وہ

مرنے شرنے والا ہوں۔ آمین۔“

اپنی کلاس لینے کے بعد وہ پال کے ڈیپارٹمنٹ آگئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے پال۔“ وہ اپنی کلاس سے باہر نکلا تو امرجہ تیزی سے اس کی طرف گئی اس کے دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔

”میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“ اسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔
”میں سب کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی۔“

امرجہ نے بے حد مضبوط انداز میں کہا۔
”مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ تم کیا چاہتی ہو؟“

”تمہیں اس رات والے واقعے میں بھی دلچسپی نہیں ہے؟“

”تمہیں اپنی بکو اس سننے کے لیے میں ہی ملا ہوں؟“ وہ بھڑکنے کی ناکام اداکاری کرنے لگا۔

”میرے بازو پر زخم ابھی تازہ ہی ہے۔ اگر تم اپنے دوستوں کے سامنے بات کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میرا خیال تھا یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔“

پال اپنے دوستوں سے الگ ہو کر آگے چلنے لگا، امرجہ اس کے پیچھے ہی تھی، دونوں ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے تو امرجہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔
”تم مجھے تھپڑ مار سکتے ہو۔“

”تمہیں پھر سے یاد دلا دوں کہ تم میرا وقت۔۔۔“
”تم اسی وقت مجھے سب کے سامنے تھپڑ مار سکتے ہو، ایک نہیں جتنے جی چاہے مار سکتے ہو میں تمہیں اجازت دیتی ہوں۔“ امرجہ نے اتنی سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”اور اگر تم نے اکیلے میں مارنے ہیں تو بھی تم مجھے برا بھلا کہہ سکتے ہو، گالیاں دے سکتے ہو، سب کر سکتے ہو، لیکن اس کے لیے تمہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی تعلیم اپنا کیہ سر داؤ پر

لگانے کی ضرورت نہیں ہے، تم اسپورٹس پرسن ہو پونی کے لیے میڈل جیت کر لائے ہو، ہیرو ہو پونی کے، لیکن اخبارات، میڈیا تمہیں لحوں میں ہیرو سے زیر و بنا دے گا۔

”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ ہنسا۔

”ہاں، سنو۔ میری بات مکمل ہونے دو، اس رات اس آدمی نے میرے منہ سے منع کرنے کے باوجود پولیس کو بلایا تھا۔ میں نے ان سے جھوٹ بول دیا تھا۔ صبح پولیس کاڈن آیا ہے انہوں نے مین روڈ پر گے کیمروں سے تمہاری فونج حاصل کر لی ہے جس میں تم میرا ڈنڈ گھسیٹ کر گلی کے اندر لے جا رہے تھے۔ انہوں نے تمہارا قد کاٹھ سب نوٹ کر لیا ہے، میں انہیں بتا سکتی تھی پال کہ یہ تم ہو۔ تم نے ہاتھوں میں جو دستاں پہن رکھے تھے وہ بھی تمہارے ہاتھ کی چھ انگلیوں کو چھپانے میں ناکام تھے۔ اگر میں پولیس سے کہوں گی تو وہ ضرور باریک بینی سے اس معاملے کو دیکھیں گے۔ مزید اگر تمہارے چاقو سے بنا زخم میں نے پولیس کو دکھا دیا تو تم جانتے ہو کہ یہ صرف ہراساں کرنے کا کیس ہی نہیں رہے گا۔ تمہیں پونی سے نکال دیا جائے گا، کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی تم نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ تمہارا کیرئیر ختم۔“

وہ اسے گھور رہا تھا۔ ”مجھے نفرت ہے تمہاری شکل سے۔“

”کیا تمہارے پاس اس نفرت کی وجہ ہے۔ ایک تھپڑ مارو اور میرا مسلمان ہونا۔ تم سو تھپڑ مجھے مار لو۔ لیکن ایسے خود کو کمرشل مت بناؤ۔ تم ہر طرح سے اپنا غصہ مجھ پر نکال سکتے ہو۔“

”تم غلط جگہ اپنا لیکچر دینے کا شوق پورا کر رہی ہو۔“

”مگلی بار مجھے نقصان پہچانا چاہو تو اتنا خیال رکھنا کہ تمہیں نقصان نہ پہنچے۔“

”تمہیں میرے نقصان کی اتنی فکر کیوں ہے؟“ وہ استہزاء سے ہنسا۔

”کیونکہ اب تم مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہو تو

ٹھیک ہے ایک مسلمان تمہارے اس قاتلانہ حملے کو درگزر کرتا ہے۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہیں پولیس کو پکڑوا سکتی ہوں، تم پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ تم پونی سے باہر ہو گے تو ایک مسلمان، ایک اسلام کو ماننے والا تمہارا کیرئیر، تمہاری نیک نامی بچا رہا ہے۔ تمہارے حملے کو درگزر کر رہا ہے۔ تم نے اسلام کو لے کر وہ سب کیوں کہا۔ میں نہیں جانتی لیکن اب تم یہ جان لو کہ تمہارے ساتھ ایسا کرنے کے لیے میرا مذہب کہہ رہا ہے۔ تم اسلام سے نفرت کرتے ہو شاید، لیکن اسلام کا پیروکار نہ تم سے نفرت کرتا ہے نہ تمہارے مذہب سے نہ ہی کرے گا۔ مجھے نفرت کا درس نہیں دیتا میرا مذہب۔ تم کسی بھی وقت میرے منہ پر آکر پھڑپھڑا سکتے ہو۔ اس کے لیے تمہیں خود کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں، مجھے خوف زدہ دیکھنے کے لیے تمہیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی یہاں پڑھتی آئی ہوں اور تم بھی۔ اگر ہم ایک دوسرے کو پسند نہیں کر سکتے تو ہمیں ایک دوسرے کا احترام ضرور کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو غیر جانب دار ہو جانا چاہیے۔ خاموش ہو کر الگ ہو جانا بہت سے مسائل حل کر دیتا ہے۔“

”میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا“ وہ سختی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہیں میری شکل نظر نہیں آئے گی۔“ امرجہ کہہ کر آگئی۔

”اسلام مگلی کا جواب مگلی نہیں ہے۔ اسلام اینٹ کا جواب برداشت ہے۔“

اینٹ کا جواب برداشت اور حکمت وہ پال کو دے آئی تھی اور اسے امید تھی کہ سب اچھا ہی ہو گا۔ کیونکہ حکمت کبھی مضرت نہیں ہوتی۔ رات کو لیڈی مر نے ان سب کو نشست گاہ میں ایک ساتھ بلایا۔

”میں تم سب سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں انسانیت کے ناتے اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر ایک ماں کی محبت کے ناتے سے۔ تم سب مجھ سے وعدہ

کرو کہ اگر کوئی میرے بارے میں اس گھر اور میرے بچوں کے بارے میں تم سے کچھ پوچھے گا تو تم ایک لفظ بھی نہیں بتاؤ گی۔“

”کچھ ہوا ہے؟“ ویرا نے پوچھا۔

”میں تفصیلات نہیں بتا سکتی، تم چاروں پوری ایمانداری سے مجھ سے وعدہ کرو کہ کوئی کسی بھی طرح کی معلومات تم سے لینا چاہے گا تو مجھے بتاؤ گی تمہارے سامنے کسی کا نام لیا جائے یا کسی کی شکل و صورت کے بارے میں پوچھا جائے تم نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالنا۔ یہ سب میں اپنے بچوں کے فائدے کے لیے کر رہی ہوں۔ میں بہت مشکل سے انہیں زندگی کی طرف لائی ہوں میں ان کے دلوں کے حال جانتی ہوں، ان پر کیا گزرتی رہی ہے۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا اس لیے ایک ماں تم سب سے درخواست کرتی ہے کہ حد سے زیادہ احتیاط کی جائے اور اگر کوئی کچھ پوچھے تو فوراً پولیس کو فون کیا جائے۔ سادھنا کے ساتھ چند دن پہلے بھی سب ہوا ہے لیکن سادھنا نے عقلی مندی کا مظاہرہ کیا اور اگر مجھے بتا دیا۔“

ان سب نے بڑی محبت کے ساتھ لیڈی مر کو وعدہ دے دیا۔

امرجہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ بریشان سی رہتی ہیں، اس نے پوچھا تو انہوں نے اتنا ہی کہا کہ یہ بہت ذاتی معاملہ ہے وہ بتا نہیں سکتیں۔



عالیان اپنی کلاس لے کر نکلا ہی تھا کہ یونین کا صدر جے پیٹرین مسٹری ہنسی ہنسا اس کے پاس آیا۔

”کسی کا خون کرنے جا رہے ہو یا گھر کے آئے ہو؟“

عالیان نے گھنٹوں کی محنت سے بنائے گئے اس کے ہیر اسٹائل کو دونوں ہاتھوں سے خراب کر دیا۔ پیٹرین اپنے نت نئے ہینو اسٹائل کے لیے یونی میں بدنام ترین تھا۔ اس وقت ایک کینگریو اس کے سر پر پوزنٹائے بیٹھا لگتا تھا۔

”تم اپنے علاوہ کسی کو خوب صورت نہیں دیکھ سکتے

؟“ وہ ہنسا گیا۔

”اب ٹھیک ہے ورنہ اس طرح ہستے تو تم کارل، کارل سے لگ رہے تھے۔“

”خدا مجھے بچائے بلکہ مجھے ماری ڈالے اگر میں کارل، کارل لگوں۔“

”بس پھر تم ایک دو دن میں مرنے ہی والے ہو۔“

”امرجہ کیسی ہے؟“ جے پیٹرین نے ایک دم سے پوچھا بلکہ کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کون؟“ عالیان نے بھرپور سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہاری دوست۔“

”میری کوئی دوست امرجہ نہیں۔“

”کم آن فریش (فرنڈ کی جدید شکل) وہی جس کے پیچھے تم ہر وقت رہا کرتے تھے۔“

”تم مجھ سے ایسی غیر ضروری باتیں کرتے آئے ہو؟“

”تم اس سے کسی وجہ سے ناراض ہو کیا؟“

”پھر وہی فضول باتیں۔“

”اچھا اچھا سنو! اسٹوڈنٹ یونین کی بلڈنگ میں موجود سیف روم جسے سیکرٹ روم بھی ہم کہہ لیتے ہیں کو جانتے ہونا۔ جہاں اسٹوڈنٹس اپنا نام ظاہر کیے بغیر کچھ بھی لکھ کر جاسکتے ہیں۔ کوئی شکایت یا کوئی بھی مسئلہ تو فریش سب سے زیادہ تمہارے خلاف شکایتیں موصول ہوئی ہیں اور درخواستیں بھی۔ اس روم کی دیواروں پر ایک آئینہ جگہ نہیں بچی، ہر خط میں لکھا ہے عالیان کی ناراضی ختم کروانی جائے، جا بجا دیواروں پر یہ پیغامات چپکے ہیں۔“

”کس نے کیا ہے یہ؟“ اب عالیان ہنسا گیا۔

”ویل فریش نام نہیں لکھا، لکھا بھی نہیں جاتا، اتنا سب بھی اس لیے بتایا کہ تم یونین کے فعال رکن ہو، مطلب صدر ہو۔“ پیٹرین نے ایک آنکھ بند کی

”اور سنو وہ راما کہہ رہا تھا کہ اگر اسٹوڈنٹ پارٹی جیسا ایک اور مذاق ہم اس لڑکی کے ساتھ کر لیں تو اس بار اس کی آنکھوں سے وہ ساگر نکلے گا کہ سارا مائچسٹر اس

میں ڈوب کر رہ جائے گا اور پھر جب آئندہ آنے والی نسلیں تحقیق کریں گی کہ آخر ماچسٹر کے ساتھ کیا بنی اور اسے ہمارے جانے والا سیلاب آخر آیا کہاں سے تھا وہ بھی ایسا غضب ناک تویش ہما کھدائی اور تحقیق کرنے کے بعد انہیں خاتون پاکستان امرجہ کی دو آنکھیں ملیں گی۔

”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“

”صرف اتنا کہ ماچسٹر کو اس ساگر میں ڈوب کر رہ جانے سے بچاؤ۔ جو بیگناہات دیواروں پر چپکے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بس بہت جلد ہم پر یہ آفت آنے ہی والی ہے، تم اسے مذاق سمجھو لیکن میری درخواست بھی۔ میں ماچسٹر کو ڈوبتے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے مجھے ناراض لوگوں کو مٹانے کا یہ انداز اچھا لگا، تم مان جاؤ گے اور پھر سے اس کے دوست بن جاؤ گے تو میں اس طریقے کو یونین اور یونیورسٹی میں رائج کروا دوں گا۔ اپنا یہ سالی بھی تو ایسے ہی مشہور ہوا ہے میں بھی ہو جاؤں گا۔“ وہ کھی کھی ہنسنے لگا۔

عالیان پر اپنی کوفت پر قابو پانا مشکل سا ہو گیا اور وہ تیزی سے انگلیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف لپکا۔

”اسٹوڈنٹ یونین کے سیکرٹ روم میں لیٹرز تم لکھ لکھ کر آتی رہی ہو؟“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آکر کھنسنے لگا۔

امرجہ خوف زدہ سی اس کی شکل دیکھنے لگی اور صرف ہاتھ میں گردن ہلا سکی۔

”وہ تمہاری ہی لکھائی میں ہیں سب۔“

”میں نے نہیں لکھے۔“ وہ اور زیادہ ڈر گئی۔

”تم نے بائیں ہاتھ سے لکھے ہیں۔“

”بائیں ہاتھ سے تو مجھ سے پین بھی نہیں پکڑا جاتا۔ یہ سب یونی فیلڈ کا کام ہو گا۔“

”یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس اتنے فارغ نہیں ہیں۔“

”اس میں فارغ ہونے کی کیا بات ہے یہ تو نیکی کا کام ہے۔“ اس کی زبان سے پھسلا۔

”تو یہ نیکی کا کام تم نے سب سے کہا کرنے کے

لیے؟“ وہ استہزائیہ ہنسا۔

”نہیں۔۔۔“ امرجہ کو اس کا انداز برا لگا۔

”تو پونڈ زدیے ہوں گے سب کو تم نے۔“ طنز سے کہہ کر وہ جانے لگا۔

یہ بات اس کے انداز سے زیادہ بری لگی۔ وہ سب میں نے لکھے ہیں۔ دادو مجھے عالیاں میں نے سیکرٹ روم کو ہزاروں خطوط سے بھر دیا ہے۔

”ایسے بے کار کام کے لیے دادو دیتا ہوں تمہیں۔“ اس نے پلٹ کر کہا۔

”تم مجھ سے ناراض ہونا پسند کرتے ہو مجھ سے۔“ وہ گھوم کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔

”تا تم سے ناراض ہوں، ٹائی ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ کرنے کے لیے کسی تعلق کا ہونا ضروری ہے اور ہمارے دور میان۔“

”تم تو کہا کرتے تھے تم میرے دوست ہو۔“

”اب میں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔“

”تم مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتے۔“

”میں معاف کر چکا ہوں۔“

”تو تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔“

”کیونکہ میں سب باتیں ختم کر چکا ہوں۔“ کہہ کر وہ رکنا نہیں چلا گیا۔

اب یہ وہی مقام تھا کہ وہ گلستان بھر کے گل اس کے قدموں میں بچھاوے گی تو بھی وہ انہیں پھلانگ کر گزر جائے گا۔ کیونکہ ایک بار وہ کانٹے بچھا چکی تھی۔ اب آسمان کے ستاروں کے جھرمٹ بھی اس کی راہوں میں ڈھیر کر دینے پر اس کی اندھیری راہوں میں روشنی نہ کر سکے گی۔

ماحول انگشت بدنداں تھا اور ہوائے اپنے پر اپنی آنکھوں پر لپیٹ کر آنکھیں میچ لی تھیں۔ قسمت سے پوچھ پڑاں نہیں کی جاسکتی کیونکہ کبھی یہ جنگیز خان کی خون آلود تلوار ہوتی ہے اور کبھی حامی طالی کا کمال سخاوت۔ قسمت۔“

☆ ☆ ☆

”اگر ساری دنیا تباہ ہو رہی ہو اور کسی ایک چیز کو آئندہ انسانی زندگی کی ترقی کے لیے قائم رہنے کی اجازت ہو تو میں یہ اجازت سائیکل کے لیے لینا پسند کروں گی۔ سائیکل۔۔۔ تکبر سے پاک، چلانے والے کی شاہی سواری۔“

شٹل کاک کے سامنے کی سڑک پر اس نے این اؤن کے ساتھ مل کر کافی مشق کر لی تھی سائیکل چلانے کی۔ سیدھی خالی سڑک پر وہ بنا ڈرے چلا لیتی، سادھنا اور این اؤن کو پیچھے بٹھا کر بھی مشق کی۔ کسی کو پیچھے بٹھا کر سائیکل چلانا اپنے لیے سائیکل چلانے والے کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن اس نے تھوڑا بہت اس سلسلے میں ڈر خوف نکال ہی لیا۔ دوپار وہ یونی کے راستے تک بھی گئی این اؤن پیچھے بیٹھی ہوئی۔

”سب ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں نا؟“ اس کا سانس گم ہو جاتا۔

”کیا واقعی؟“ این اؤن اپنا ہیروینڈ ٹھیک کرنے لگی۔

”ناگل مجھے دیکھ رہے ہیں۔“ سائیکل ڈگر گائی۔

”کیوں۔ تم ہو کیا جو تمہیں دیکھا جائے۔“

”پاکستانی۔ پاکستانی لڑکی سائیکل چلا رہی ہے نا۔“

”پاکستانی لڑکی سائیکل چلائے تو اسے سب دیکھتے ہیں۔ کیوں ایسا تضاد کیوں۔“ شکوہ۔۔۔ چپ کر جاؤ این اؤن میں نے تمہیں گرا دینا ہے۔“ ڈھمکی۔

”تم مجھے گرا دو۔ لیکن سائیکل تو تھوڑی تیز چلاؤ۔ کم سے کم میں آخری لپکچر تو لے لو۔“

”ٹھہرو اس بس کو گزر جانے دو“ اس کے ڈرائیور کو بات جلدی ہے۔“ اس نے سائیکل روک دی، کوئی بچا سو بس بار روکی کہ یہ کار گزر جائے، یہ شرارتی بد تمیز لڑکا گزر جائے، ذرا ٹریفک کم ہوئے، سڑک خالی ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ مزید وغیرہ وغیرہ بھی۔

”جو بس ہمارے پیچھے ہے اسے بھی مقرر جانے دو۔ اور جو اس کے پیچھے ہے اسے بھی آگے آ لینے دو۔ آگے آکر اسے بھی گزر جانے دو۔ ٹھہرو مجھے بس میں

ہی بیٹھ جائے دو۔“

”خبردار جو تم اتریں این۔“

”اس رفتار سے تمہارے سائیکل چلانے کے دوران میں دس بار اتر کر بیٹھ چکی ہوں، بیٹھ بیٹھ کر تھک جاتی ہوں تو کھڑی ہو کر ساتھ چلنے لگتی ہوں، اور اس ایشین فلیگ کو تھوڑے اور بل دو گردن میں، میں تابوت میں بند ہو کر جلیان واپس جانا نہیں چاہتی۔“

سائیکل روک کر اس نے ایشین فلیگ کو دو اور بل دیئے گردن میں، اس نے جینز پر ٹاپ پین رکھا تھا تاکہ زیادہ یورپین لگے۔ سر پر اس نے کیپ پین رکھی تھی جس کی جھری سے اس کے لمبے بالوں کی ٹیل باہر نکلی ہوئی تھی۔

یونی کی طرف جاتے دامن اور رمانے اسے دیکھا اور دونوں نے سارے دانت نکال دیئے اور چلتے چلتے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ دامن نے ہاتھ سے ہر فیکٹ کا اشارہ بھی کیا اور اتنی سی بات پر وہ سائیکل گرا بیٹھی۔ این اؤن بھاگ کر یونی چلی گئی وہ اکیلی پیدل سائیکل کو لیے یونی تک آئی۔

”یہ پاکستانی، ہندوستانی برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے خطے کی لڑکیاں ایسے سائیکل چلائیں انہا کو اس باختہ کر دیتے ہیں۔“ غصے سے وہ ان پر بڑبڑانے لگی۔

آنے والے دنوں میں آدھا راستہ وہ چلاتی اور آدھا راستہ این اؤن، تب ہی کہیں جا کر وقت پر یونی پہنچ پاتے کبھی دیر ان کے آگے آگے ہوتی گاڑی کی صورت۔ وہ تیز سیٹی بجاتی اور دوسرے سائیکل سواروں کو پیچھے کرتی جاتی کہ بیک لیڈی آف پاکستان اپنی سواری چلا رہی ہیں، تھوڑا ڈرتی ہیں ذرا پیچھے پیچھے ہو جائیں۔

ایک دن ایسے ہی راستے میں وغیرہ وغیرہ سے ڈر کر سائیکل کو روکے وہ بمشکل یونی روڈ تک آئی کہ پیچھے سے ایک دم سے عالیاں کی سائیکل عین اس کے پہلو میں دائیں طرف برابر میں آئی۔ وہ بھی اپنے دھیان میں تھا امرجہ بھی اور جب امرجہ کی اس پر نظر پڑی تو وہ اتنی بری طرح سے گھبرا گئی کہ دائیں رخ ٹھیک اس کی

سائیکل کے اوپر سائیکل گرا بیٹھی۔

این اون جالبانی میں چلائی جس کا اردو میں ترجمہ ہے
”ہائے ماں جی مجھے مار ڈالا۔“

امرحہ کی سائیکل پوری کی پوری عالیان کی سائیکل
کے اوپر تھی، خود وہ بھی پورے اور یہ سب ایسے ہوا

کہ۔

”وہ آیا۔ اسے دیکھا۔ اور اسے گرا دیا۔“
دو سائیکلوں کے اس ٹکراؤ سے مائچسٹر کا روڈ ٹل سا
گیا۔ اور اس کے نتیجے میں جو کلام سب سے برا ہوا وہ
یہ تھا کہ اس کی سائیکل کے آگے لگے اسٹینڈ باکس میں
کچھ سینڈویچز نشوونما میں لیے رکھے تھے شاید وہ ناشتا کر
کے نہیں نکلا تھا اور وہ ناشتا آکسفورڈ روڈ پر نکل کر گر گیا
تھا اور دو عدد سینڈویچز روڈ پر پھینکے بکھرے پڑے تھے
اب وہ کچھ بھی ہوں گے لیکن سینڈویچز نہیں ہوں
گے۔

عالیان نے ایک غصیلی نظر امرحہ پر والی اور پھر
سینڈویچز کو دیکھا اور جیسے رو دینے کو ہو گیا۔ اس بے
چارے کا کتنا برا نقصان ہو گیا تھا۔
”میری غلطی نہیں ہے۔“ امرحہ بھی رو دینے کو
ہو گئی۔

اس نے اپنی سائیکل اٹھائی۔ بے چارے ہو چکے
سینڈویچز سمیٹے اور جانے لگا۔

”عالیان!“ این اون نے آواز دے کر روکا اور اس
کے پیچھے سائیکل پر بیٹھ گئی۔

اب سارا مائچسٹر اس کی سائیکل کے پیچھے بیٹھے گا
سوائے اس کے۔

یونی کے اندر جا کر این اون کو ڈھونڈا اسے برگر لے
کر دیا۔

”کتنا تمہاری طرف سے ہے۔“
”تمہاری طرف سے مجھے اور میری طرف سے
عالیان کو؟“

”باگل کتنا ٹوٹیٹ ہے لے لو۔“
”پر میں تم سے ٹوٹیٹ لینا نہیں چاہتی نہ اسے دینا
چاہتی ہوں۔“

امرحہ نے اس کی پونی کھینچی اور آدھا گھنٹہ لگا کر
اسے ساری بات سمجھائی۔

این اون برگر ہاتھ میں لے کر بزنس اسکول کی
طرف جانے لگی، کچھ فاصلہ رکھ کر امرحہ بھی اس کے
پیچھے پیچھے تھی اسے ڈر تھا کہ وہ ضرور کوئی گڑبڑ کرے گی
اور گڑبڑ ٹھیک اس کے سامنے آگئی۔

کارل نے برگر ہاتھ میں لیے ایک ننھی بچی کو
خاموشی سے جاتے دیکھا تو رک گیا اور اس کا حال
احوال پوچھنے لگا اور پھر برگر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
این بچی ہی تھی کہ اس نے فوراً ”برگر کی ایک بڑی
بائیٹ لے۔“

”تم نے کارل کو برگر کیوں دیا؟“ امرحہ رو دینے کو
ہو گئی۔

”اس نے کہا وہ عالیان کے پاس ہی جا رہا ہے اور
اسے وہ برگر دے دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا
کیا اور آگئی۔“

”ایک بار پھر جاؤ اس کا سر پھوڑو اور آجاؤ۔“
”یہ کام اب تم کر لو۔ میں تھک گئی ہوں۔“ کہہ

کر وہ ننھی بچی چلی گئی۔
بڑی بچی دل مسوس کر کھڑی رہی۔ ”کاش کوئی
عالیان کو ٹوٹیٹ دے دے۔“

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کچھ کرنے کا کہ ویرا ہاتھ
میں برگر اور کافی لیے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتی ہوئی
نظر آئی۔

امرحہ کا دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہا۔ کیا
اتنے بڑے روس میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی کہ ویرا
وہاں پڑھ سکتی اسے مائچسٹر آنے کی کیا ضرورت تھی
بھلا؟

اندھیرے غار میں بند پڑے رہنے کی کیفیت تھی۔
کسی ایک طرف سے روشنی لپک رہی تھی۔

روشنی کی لپک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ غار کا دھن کل
رہا تھا۔ پرسکون اور آزاد ہو جانے کی کیفیت تھی۔

کہ دور سے آتی چاپ قریب آتی محسوس ہوئی، سنا

دینے والی چاپ کہ کھنوں میں سردے لیا جائے۔
کان لیٹ لیے جائیں۔ ایک ہولنا بنا قریب سا
آیا۔ لمبے سائے کے اس پار روشنی کے دھن کے
نین سامنے کھڑا ہوا اور ساری روشنی کو پیچھے دھکیل
دیا۔ اور اندھیرا۔

عالیان ہڑبڑا کر اٹھا۔ نیم اندھیرے کمرے میں
وحشت زدہ خود کو بستر پر پایا۔ اس کی سانس تیز تیز چل
رہی تھیں جیسے رات بھر بھاگتا رہا ہے کوئی اس کے
پیچھے تھا۔ اس کے کانوں میں وہ التجائی چاپ ابھی بھی
زندہ تھی۔ وہ اسے محسوس کر رہا تھا۔ وہ خواب میں
سے ہو کر آیا تھا۔ جیسے خود کو کھینچ کر خواب سے باہر
نکلا تھا وہ خوف زدہ بھی تھا۔ یا کچھ اور تھا۔ جو بھی
تھا اس کی دائیں آنکھ میں آنسو تھا۔

امرحہ رات کو چاپ سے واپس آ رہی تھی کہ سڑک
کے کنارے چلتے اسے ایک آدمی نے بہت مزیدار
انداز سے روکا۔

”خاتون آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔“
امرحہ رک گئی۔ ”فرمائیے۔“

”آپ خاتون مہر کی بی بی ہیں؟“
”نہیں۔“ امرحہ ننھی آدمی لیڈی مہر کے مرحوم
شوہر کے رشتے داروں میں سے کوئی ہے۔

”ان کی لے لالک بی بی نہیں ہو؟“
”نہیں میں تو پاکستان سے آئی ہوں یونیورسٹی میں
پڑھنے ان کے گھر میں رہتی ہوں پے ان گیٹ
ہوں۔“

”چھالے اس کا مطلب تم ان کے سب بچوں کو
جانتی ہو گی۔ جتنے اس خاتون نے لے کر پالے
ہیں۔“

امرحہ کو ایک دم سے لیڈی مہر کی بات یاد آگئی اور وہ
آگے چلنے لگی۔

”میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔ آپ
جائیں یہاں سے۔“

”انہوں نے دس بچے پالے ہیں کیا تم سب کے نام
جانتی ہو۔ ان کی شکلیں۔“ امرحہ اور تیزی سے
چلنے لگی وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”مجھے صرف لڑکوں کے بارے میں معلومات
چاہئیں۔ کہ وہ کہاں ہیں، کس ملک میں ہیں کون کون
ہیں، ان کی تصویریں مل سکیں تو بہتر ہو گا۔ تم یہ چھوٹی
سی چاپ کرتی ہو کتنا کمالتی ہو۔ میں تمہیں پورے
ایک لاکھ پونڈوں گا۔“

امرحہ حیرت سے رک کر اسے دیکھنے لگی یہ کون تھا
جو اتنی بڑی رقم دینے کو تیار تھا۔

”اگر چاہو تو زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔“
”میں پولیس کو بلا لوں گی جناب!“

”دو لاکھ پونڈ۔ تین لاکھ پونڈ۔ جواب دو۔“
جانتی ہو کتنے پیسے ہوئے ہیں یہ۔۔۔ محل سے میری
بات سنو، تم جذباتی ہو کر بھاگ رہی ہو، تمہیں کچھ
زیادہ کام نہیں کرنا صرف اتنا کہ وہ سب لڑکے اس
وقت کہاں ہیں۔ کس کس ملک میں ہیں ان کے نام
کیا ہیں۔ بس اتنا ہی اور اتنے سے کام کے اتنے
پیسے۔ اتنے کہ تم ساری زندگی میں شاید ہی کما سکو
گی۔“

”پہلے بچوں کو چھوڑ جاتے ہو پھر انہیں ڈھونڈتے
اور خریدتے پھرتے ہو؟“ امرحہ نے طنز سے کہا۔

اس نے بہت سکون سے امرحہ کے طنز کو
سنا۔ ”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن اگر تم تھوڑا سا
تعاون کرو تو بہتر ہو گا۔“

”میں کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کروں گی۔“
”جاؤ۔“

”چار لاکھ پونڈ۔“
”میں پولیس کو فون کرنے لگی ہوں۔“ امرحہ
نے فون نکال کر ہاتھ میں لیا۔

”پانچ لاکھ پونڈ۔“
امرحہ نے عاجز آ کر اس کی شکل کی طرف دیکھا اور
نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ”تمہارا کام بہت آسان ہے
تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کس لڑکے کی ماں کا
نام مارگریٹ جوزف تھا۔“

امرحہ فون کان سے لگانا بھول گئی وہ اس انسان کی
شکل دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید



امرحہ کی بدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں دادی اور متنبوں بہن بھائی دانیہ عماد اور علی اسے اکثر جنم جلی "منحوس" کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قہقہے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روٹی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب ہنسی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پڑھو اور اسکالرشپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے مگر دادا کی بات پر وہ ناپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر نہ ہلگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج ویونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالرشپ فارم بھرتی ہے مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالا خرما چیمبرلینورسٹی سے اسے اسکالرشپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلباء سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دولہا کی میزبانی کے

مکمل ناول

